ISSN 0970-180X

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

روزہ اس بات کا سبق ہے کہ ——
کبھی ایک جائز چیز بھی ناجائز ہو جاتی ہے
اور کبھی ایک مطلوب چیز بھی غیر مطلوب

مئی ۱۹۸۷ شمارہ ۱۲۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۲۶ مئی ۱۹۸۷

فہرست

رمضان کا سبق

عَن ابی ھُریرۃَ قالَ: قَالَ رسولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ علیہِ وسلّم: کُلُّ عَمَلِ ابنِ آدم یُضَاعَفُ الحسنۃُ بِعَشرِ اَمثَالِھَا اِلٰی سَبعِمِائَۃِ ضِعفٍ، قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: إلاَّ الصَّومَ فَانَّہُ لِی وَاَنَا اَجزِی بِہٖ، یَدَعُ شَھوَتَہٗ وَطَعَامَہٗ مِن اَجلِی، لِلصَّائِمِ فَرحَتَانِ: فَرحَۃٌ عِندَ فِطرِہٖ، وَفَرحَۃٌ عِندَ لِقَاءِ رَبِّہٖ۔ (متفق علیہ)

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابن آدم کا ہر نیک عمل دس گنا سے سات سو گنا تک بڑھایا جاتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ بندہ اپنی شہوت کو اور اپنے کھانے کو میرے لیے چھوڑتا ہے۔ روزہ دار کے لیے دو خوشی ہے۔ ایک خوشی افطار کے وقت اور دوسری خوشی اس وقت جب وہ اپنے رب سے ملے گا۔

روزہ عام عبادات سے الگ ایک عبادت ہے۔ روزہ میں آدمی اپنی جائز خواہش کو اور اپنے جائز کھانے کو اللہ کی خاطر چھوڑ دیتا ہے۔ گویا روزہ دار روزہ رکھ کر اپنے اس عزم کا اظہار کرتا ہے کہ اللہ کی خاطر اگر اس کو انتہائی ضروری اور جائز چیزوں سے جدائی اختیار کرنا پڑے تو اس سے بھی وہ دریغ نہیں کرے گا۔ روزہ کی یہی وہ امتیازی خصوصیت ہے جس کی بنا پر اس کا امتیازی ثواب رکھا گیا ہے۔

موجودہ دنیا میں حق پرست بننے کے لیے صرف یہی کافی نہیں کہ آدمی غلط اور صحیح کے درمیان تمیز کرتا ہو۔ مختلف حالات کے اعتبار سے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ممنوعات کی فہرست مزید وسیع ہوجاتی ہے۔ کبھی ضروری ہوجاتا ہے کہ آدمی کھانا پینا بھول کر اپنی ڈیوٹی انجام دے۔ وہ عمل کے بجائے اعراض کا طریقہ اختیار کرے۔ وہ کرنے کا جذبہ رکھتے ہوئے بھی نہ کرے۔ الفاظ رکھتے ہوئے وہ نہ بولے اور پاؤں رکھتے ہوئے وہ نہ چلے۔ ایک کام کو بظاہر صحیح سمجھتے ہوئے بھی اس کی طرف اقدام کرنے سے باز رہے۔

روزہ اسی قربانی کا سبق ہے۔ اس دنیا میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک جائز چیز بھی آدمی کے لیے ناجائز بن جاتی ہے۔ اور ایک مطلوب چیز بھی نامطلوب کی حیثیت اختیار کرلیتی ہے۔ یہ ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے۔ جو لوگ اس اعلیٰ ایمانی درجہ پر پورے اتریں ان کے لیے اللہ کے یہاں اتنا بڑا اجر ہے جس کا نہ کوئی شمار ہے اور نہ کوئی حساب۔

شیطان کا حملہ

ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پچھلے پیغمبروں میں سے ایک پیغمبر سے شیطان کا مکالمہ ہوا۔ یہ ایک لمبی روایت ہے، اس کا ایک حصہ حسب ذیل ہے:

قَالَ النبیُّ وَاِنِّیْ وَاللّٰہِ مَا اَحسستُ بکَ قَطّ الاّ استعذتُ باللّٰہ منکَ۔ قال عدوُّ اللّٰہ صَدقتَ بھٰذا تنجُومِنِّیْ فَقَالَ النبیُّ اَخْبِرْنِیْ بایِّ شیٍٔ تغلب ابن آدم قال آخذہ عند الغضب والھویٰ۔

(تفسیر ابن کثیر، الجزء الثانی، صفحہ ۵۵۱)

(شیطان نے کہا کہ تم کس طرح مجھ سے نجات پاؤ گے) پیغمبر نے کہا کہ خدا کی قسم جب بھی میں نے تیری طرف سے کچھ محسوس کیا تو میں نے تجھ سے اللہ کی پناہ مانگی۔ دشمنِ خدا نے کہا کہ تم نے سچ کہا۔ اسی کے ذریعہ تم مجھ سے نجات پا سکتے ہو۔ پھر پیغمبر نے کہا کہ مجھے بتاؤ کہ تم کس چیز کے ذریعہ دوبارہ انسان کے اوپر غلبہ حاصل کرو گے۔ شیطان نے کہا کہ غصہ اور خواہش کے وقت۔

اس سے معلوم ہوا کہ آدمی جب غصہ میں ہوتا ہے یا جس وقت اس پر کسی خواہش کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ شیطان کے لیے غیر محفوظ (Vulnerable) بن جاتا ہے۔ ایسا ہر موقع آدمی کے اندر ایک ایسی کمزوری پیدا کر دیتا ہے جہاں سے شیطان آدمی کے اندر داخل ہو جائے اور اس کو اپنا شکار بنالے، وہ اس کو جنّت کے رُخ سے ہٹا کر جہنّم کے رخ پر چلانے لگے۔

آدمی کو سب سے زیادہ جس چیز سے ڈرنا چاہیے وہ خود اس کا اپنا غصہ اور اس کی خواہش پرستی ہے۔ اس خطرہ سے بچنے کی تدبیر یہ ہے کہ جب بھی آدمی اپنے اندر اس قسم کے احساسات پائے وہ اس کو شیطان کا حملہ سمجھے اور فوراً شیطان کے مقابلہ میں اللہ کی پناہ مانگنے لگے۔ جب آدمی کے اندر غصہ بھڑکتا ہے تو وہ شیطان کے زیر اثر آجاتا ہے۔ جب اس پر کوئی خواہش غالب آتی ہے تو اندیشہ ہوتا ہے کہ شیطان اس کو اپنے قابو میں کرلے گا۔ ایسے ہر موقع پر گناہ اور بے انصافی سے بچنے کی واحد کارگر تدبیر یہ ہے کہ آدمی اللہ کی مدد مانگے، وہ شیطان کے مقابلہ میں اللہ کی پناہ میں آجائے۔

غلط فہمی

ایک عورت امام اوزاعی کی بیوی کے پاس آئی۔ اس نے گھر کی چٹائی کو چھوا تو وہ بھیگی ہوئی تھی۔ عورت نے کہا کہ شاید بچہ نے یہاں پیشاب کر دیا ہے۔ امام اوزاعی کی بیوی نے کہا کہ نہیں، یہ دراصل امام اوزاعی کے آنسو ہیں۔ ہر صبح کو وہ ایسا ہی کرتے ہیں:

دخلت امرأة على زوجة الاوزاعي فلمست الحصير فاذا هو مبتلّ فقالت: لعل الصبي بال هنا فقالت زوجة الاوزاعي: انما هي دموع الشيخ كل صباح يفعل هكذا۔

الدعوة (ریاض) ۲۳ فروری ۱۹۸۷، صفحہ ۲۹

عورت نے چٹائی کے بھیگنے کا جو سبب سمجھا وہ صرف اس کے اپنے ذہن کی پیداوار تھا۔ خارج میں اس سبب کا کوئی وجود نہ تھا۔ یہ عورت کے سمجھنے کی غلطی تھی نہ کہ صورت حال کی واقعی تشریح۔ عورت بذات خود یہ سمجھ رہی تھی کہ اس نے جان لیا ہے، حالاں کہ اس نے کچھ نہیں جانا تھا۔ اس نے اپنی لاعلمی کو علم قرار دے لیا۔ اس نے محض ذاتی خیال کے تحت ایک رائے قائم کرلی۔ حالانکہ صحیح رائے وہ ہے جو تمام متعلقہ حقائق کا جائزہ لینے کے بعد قائم کی جائے۔

اکثر حالات میں آدمی اپنی ذہنی سطح کے مطابق رائے قائم کرتا ہے۔ عورت کی ذہنی سطح وہی تھی جس کا اظہار اس کے سوال میں ہوا۔ اس نے اپنا یہ سوال کسی بری نیت سے نہیں کیا۔ اور نہ وہ جھوٹ بولی۔ اس کے باوجود وہ مکمل طور پر غلطی پر تھی۔ اس کی غلطی کی سادہ سی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی ذات سے اوپر اٹھ کر سوچ نہ سکی۔ اپنی روزانہ کی زندگی میں وہ جس چیز کا تجربہ کر رہی تھی، اسی پر اس نے دوسرے کے معاملہ کو بھی قیاس کرلیا۔ جس چیز سے وہ خود دوچار تھی اسی کو اس نے دوسرے کی طرف منسوب کر دیا۔

یہ مثال بتاتی ہے کہ آدمی کو دوسرے کے متعلق رائے قائم کرنے میں حد درجہ محتاط ہونا چاہیے۔ عین ممکن ہے کہ وہ "دموع الشیخ" کو "بول الصبی" سمجھ لے۔ جو واقعہ اپنے اندر ایک بندے کے خوف خدا کی کہانی لیے ہوئے ہے، نادانی کی بنا پر وہ اس کو دنیا پرستی کا نتیجہ قرار دے بیٹھے۔ جو واقعہ آخرت کی یاد دلانے والا ہے وہ اس کے ذہن میں صرف دنیا کی یاد دلانے والا بن جائے۔

روزانہ دس لفظ

مولوی لطف اللہ ایک معمولی ٹیوٹر تھے۔ وہ ۱۸۰۲ء میں مالوہ کے قدیم شہر دھارانگر میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے کسی انگریزی درس گاہ میں ایک دن بھی نہیں پڑھا۔ مگر ان کی خود نوشت انگریزی سوانح عمری ۱۸۵۷ میں لندن سے چھپی۔ لندن کے پبلشر اسمتھ ایلڈر اینڈ کمپنی نے اس کا نام یہ رکھا:

Autobiography of Lutfullah: A Mohammedan Gentleman

اس کتاب کے ساتھ ایک انگریز مسٹر ایسٹ ویک کا دیباچہ شامل ہے۔ انھوں نے دیباچہ میں مصنف کی صحیح انگریزی کی تعریف کی ہے۔ انھوں نے اس پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ ایک ہندستانی نے بدیسی زبان میں اتنی ضخیم کتاب کس طرح لکھی۔

مولوی لطف اللہ نے یہ صلاحیت کیسے پیدا کی کہ وہ انگریزی میں ایک ایسی کتاب لکھیں جو لندن سے چھپے اور انگریز ادیب اس کی زبان کی تعریف کرے، اس کا راز صرف چار حرف کا ایک لفظ ہے اور یہ وہی لفظ ہے جس کو اردو زبان میں محنت کہتے ہیں۔

مولوی لطف اللہ نے انگریزی زبان صرف اپنی محنت سے سیکھی۔ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز ملازموں کو ہندستانی، فارسی اور مرہٹی زبانیں سکھاتے تھے۔ ان کے انگریز شاگردوں کی تعداد سو سے اوپر تھی۔ انگریزوں سے تعلق کے نتیجہ میں ان کے اندر انگریزی زبان سیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ انھوں نے ذاتی مطالعہ سے انگریزی زبان پڑھنا شروع کیا۔ اور آٹھ سال کی لگاتار محنت کے نتیجہ میں اس پر پوری طرح قدرت حاصل کر لی۔ انھوں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اس آٹھ سال کی مدت میں "کوئی ایک رات ایسی نہیں گزری جب کہ سونے سے پہلے میں نے انگریزی کے دس لفظ یاد نہ کیے ہوں اور ڈاکٹر گل کرسٹ کی قواعد کی کتابوں کے چند صفحے توجہ سے پڑھ کر ذہن میں محفوظ نہ کیے ہوں۔" "دس لفظ" بظاہر بہت کم معلوم ہوتے ہیں۔ مگر دس لفظ روزانہ کی رفتار کو جب آٹھ سال تک پھیلا دیا جائے تو وہ ایک شخص کو غیر زبان کا ایسا ادیب بنا دیتے ہیں کہ اہلِ زبان بھی اس کی زبان دانی کا اعتراف کریں۔

مقصد کا تقاضا

ٹائمس آف انڈیا (۲۶ مارچ ۱۹۸۷) کے ساتھ ایک ضمیمہ (The Times Offspring) شائع ہوا ہے۔ اس ضمیمہ میں مشہور انگریزی صحافی مسٹر خوشونت سنگھ کا ایک انٹرویو درج ہے۔ اس انٹرویو کا ایک سوال وجواب یہ ہے :

Q: You are a media man. How is it that you are so against television, as you once mentioned in your 'Malice' column?
A: Well, I am against my viewing it. I had one set in Bombay at my residence. As a result I could not concentrate on anything else. I would simply switch onthe T.V. and see the programme being transmitted, whatever nonsense it might be. So I told the television company to take it back, since I prefer to read and write.

سوال: آپ میڈیا کے ایک آدمی ہیں۔ ایسا کیوں ہے کہ آپ ٹیلی ویژن کے اس قدر مخالف ہیں جیسا کہ آپ نے ایک بار اپنے مستقل کالم میں لکھا تھا۔

جواب: جی ہاں، میں اپنے ٹیلی ویژن دیکھنے کے خلاف ہوں۔ بمبئی میں میرے مکان میں ایک ٹیلی ویژن سٹ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں کسی بھی دوسری چیز پر اپنے ذہن کو لگا نہیں پاتا تھا۔ میں بس ٹی وی کا بٹن دبا دیتا اور جو کچھ اس پر آتا اس کو دیکھتا رہتا، خواہ وہ کتنا ہی بے معنی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ میں نے ٹیلی ویژن کمپنی سے کہا کہ وہ اس کو واپس لے جائے۔ کیوں کہ میں لکھنے پڑھنے کو زیادہ پسند کرتا تھا۔

مسٹر خوشونت سنگھ نے اس معاملہ میں جو کچھ کیا اس کو ہماری زبان میں " ترجیح " کہا جاتا ہے۔ ترجیح کا یہ اصول کسی بامقصد انسان کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ اگر آپ کے سامنے ایک مقصد ہو تو آپ کو لازماً یہ کرنا پڑے گا کہ آپ اصل مقصد کے سوا دوسری تمام چیزوں میں اپنی دل چسپی ختم کر دیں۔ اپنی توجہ کو دوسری تمام سمتوں سے ہٹا کر صرف مقصد کے رُخ پر لگا دیں۔ یہ کامیابی کی لازمی شرط ہے، اس کے بغیر موجودہ دنیا میں کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کی جا سکتی۔

ایک چیز کو پانے کے لیے دوسری چیز کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ اگر آپ چھوڑنے والی چیز کو نہ چھوڑیں تو اس دنیا میں آپ پانے والی چیز کو بھی نہیں پائیں گے۔

بے مسئلہ انسان

۵ ستمبر ۱۹۸۶ کو کراچی ائرپورٹ پر ہائی جیکنگ کا واقعہ ہوا۔ یہ پان ایم کا جہاز تھا۔ اس حادثہ میں جو لوگ مارے گیے ان میں سے ایک ۲۴ سالہ خاتون نیرجا بھانوت (Neerja Bhanot) بھی تھی۔ وہ اس امریکی ہوائی کمپنی میں سینئر فلائٹ پرسر (Senior purser) تھی۔ اس حادثہ کے بعد اس کے باپ ہریش بھانوت نے ایک مفصل یادداشت لکھی جو ہندستان ٹائمس (۵ اکتوبر ۱۹۸۶) میں شائع ہوئی۔ اس یادداشت میں مسٹر ہریش بھانوت نے اپنی لڑکی کے بارے میں جو باتیں لکھی تھیں ان میں سے ایک بات یہ تھی کہ نیرجا اول دن سے بے مسئلہ لڑکی تھی :

Neerja was a no-problem child, right from day one.

عام طور پر چھوٹے بچے گھر کے اندر مسئلہ بنے رہتے ہیں۔ وہ طرح طرح سے اپنے ماں باپ کو پریشان کرتے ہیں۔ اس لیے ایسے بچہ کو بے مسئلہ بچہ (No problem child) کہا جاتا ہے جو ہر حال میں مطمئن رہے اور کسی بھی بات پر گھر والوں کے لیے مسئلہ پیدا نہ کرے۔

سب سے بہتر بچہ بے مسئلہ بچہ ہے۔ یہی بات بڑوں کے لیے بھی صحیح ہے۔ وہ آدمی سب سے زیادہ قیمتی ہے جو بے مسئلہ ہو۔ جو دوسروں کے لیے مسائل پیدا کیے بغیر دوسروں کے ساتھ رہ سکے۔ اس دنیا میں ذاتی شکایت کا پیدا ہونا لازمی ہے، اس لیے قابلِ عمل صورت صرف یہ ہے کہ آدمی خود اپنے آپ کو بے شکایت بنالے۔

یہ انسانی خصوصیت عام زندگی کے لیے بھی نہایت ضروری ہے، اور تحریکوں کے لیے تو وہ لازمی ضرورت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس دنیا میں وہی تحریک کامیاب ہوتی ہے جو اپنے گرد ایسے افراد کو جمع کر سکے جو مسائل پیدا کرنے والے نہ ہوں۔ جو مسائل سے بھری ہوئی دنیا میں ایسے بن جائیں گویا دوسروں کی نسبت سے ان کا کوئی مسئلہ ہی نہیں۔

جو شخص بے مسئلہ ہو وہی دوسروں کے مسائل کو حل کرتا ہے۔ جو لوگ خود مسائل میں مبتلا ہو جائیں وہ صرف دنیا کے مسائل میں اضافہ کریں گے، وہ کسی بھی درجہ میں دنیا کے مسائل کو حل نہیں کر سکتے۔

روحیں منتظر ہیں

کریٹ (Crete) یونان کا ایک جزیرہ ہے۔ یہاں ۱۶۶۹ میں ترکوں کا قبضہ ہوا۔ اس کے بعد یونانیوں اور ترکوں کے درمیان کئی لڑائیاں ہوئیں۔ آخر کار ۱۸۹۸ء میں کریٹ سے ترک اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ اس بنا پر ترکوں کی تاریخ میں کریٹ کے واقعات کا تذکرہ بھی لازمی طور پر شامل رہتا ہے۔

محمد حفیظ اللہ قریشی مرحوم نے ۱۹۲۲ میں لاہور سے ایک کتاب شائع کی تھی جس کا نام تھا "تاریخ سلاطین آل عثمان"۔ ڈھائی سو صفحہ کی اس کتاب میں خاندان عثمانیہ (ترکوں) کے حالات بیان کیے گیے ہیں۔ اس میں سلطنت عثمانیہ کی ابتدا سے لے کر سلطان عبدالمجید ثانی کی معزولی تک کے حالات مختصر طور پر درج ہیں۔ کریٹ کے ساتھ ترکوں کی جنگ کے حالات لکھتے ہوئے کتاب میں بتایا گیا ہے:

۱۰۶۶ھ میں بندقیہ والوں کا ایک عیسائی امیر البحر مع ۳۰ سپاہیوں کے سلطان محمد خاں رابع (۱۰۵۹ - ۱۰۹۹ھ) سے آملا۔ اور آستانہ (ترکی) میں آکر اس نے صدق دل سے مذہب اسلام قبول کر لیا۔ چنانچہ سلطان نے اس کی قدر افزائی کی۔ اور اس کو کارخانہ جہاز سازی کا نگراں بنا دیا۔ اس نے اپنی حسن کارگزاری سے سلطان کو ہی خوش نہیں کیا بلکہ اسلام کی بے حد خدمت بجا لایا اور اپنے گزشتہ گناہوں کی تلافی مافات کر دی۔ (صفحہ ۱۰۶ - ۱۰۵)

اسلامی تاریخ میں اس طرح کے واقعات بہت ملتے ہیں کہ عین جنگ کے زمانہ میں دشمن کے افراد نے اسلام قبول کر لیا۔ وہ عین ہنگامہ کارزار میں دشمن کی صف کو چھوڑ کر اہل اسلام کی صف میں شامل ہو گیے۔ ان واقعات سے اسلام کی تسخیری طاقت کا اندازہ ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام فطرت کا دین ہے۔ وہ اپنے اندر ہر آدمی کے لیے بے پناہ کشش رکھتا ہے۔ ہر آدمی کے دل میں اسلام کی طلب چھپی ہوئی ہے۔ ہر روح اس انتظار میں ہے کہ کب موقع ملے اور وہ خدا کی ابدی دنیا میں داخل ہو جائے۔ اسلام کی یہ تسخیری طاقت اتنی زبردست ہے کہ جنگ بھی اس کے لیے رکاوٹ نہیں۔ عداوت کی فضا بھی اس کی راہ میں حائل نہیں۔

حسد کے نقصانات

بہمنی سلطنت ۱۳۴۷ء میں سلطان محمد بن تغلق سے بغاوت کرکے قائم ہوئی۔ اس کا بانی حسن گنگو تھا۔ حسن کا کہنا تھا کہ وہ ایران کے قدیم بادشاہ بہمن کی اولاد سے ہے۔ اس بنا پر اس کا خاندان بہمنی خاندان کہا جاتا ہے۔

حسن گنگو نے گلبرگہ کو اپنی راجدھانی قرار دیا اور اپنی سلطنت کے حدود کو بڑھانا شروع کیا۔ ۱۳۵۹ء میں حسن گنگو کی وفات ہوئی۔ اس کے بعد اس کا جانشین احمد شاہ بہمنی ہوا۔ اس نے شہر بیدر بسایا اور گلبرگہ کے بجائے بیدر کو اپنی راجدھانی قرار دیا۔

دکن کی یہ بہمنی سلطنت ۱۸۰ سال تک رہی اور ۱۵۲۷ء میں ختم ہوگئی۔ اس سلطنت کا وزیر ۱۴۶۳ سے لے کر ۱۴۸۱ تک محمود گواں تھا۔ اس کا زمانہ بہمنی سلطنت کا سب سے زیادہ کامیاب زمانہ ہے۔ اس نے سلطنت کو مزید وسیع کیا اور اپنے تدبر سے اس کو نہایت مستحکم کیا۔ مورخین نے بالاتفاق اس کی اعلیٰ لیاقت کا اعتراف کیا ہے۔ ایک مورخ نے لکھا ہے کہ "محمود گواں تاریخ ہند کے بہترین مدبروں اور منتظموں میں شمار کیا جاتا ہے۔" انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے اس کی بابت یہ الفاظ لکھے ہیں:

The most notable personality of the period.
a leading administrator (9/372).

(اس عہد کی سب سے زیادہ ممتاز شخصیت، ایک اعلیٰ انتظام کار) این ایڈوانسڈ ہسٹری آف انڈیا (۱۹۸۷) کے مصنفین نے ان الفاظ میں اس کے اخلاص کا اعتراف کیا ہے:

Though possessed of wide powers, Mahmud Gawan never abused his authority. By virtue of his skilful diplomacy and successful military operations, he brought the dominions of the Bahmanis to an extent never achieved by former sovereigns.
An Advanced History of India (1987) p. 354

اگرچہ محمود گواں کو نہایت وسیع اختیارات حاصل تھے مگر اس نے کبھی اپنے اختیار کا بے جا استعمال نہیں کیا۔ اپنی ماہرانہ سیاست اور اپنے کامیاب فوجی اقدامات کے ذریعہ اس نے بہمنی سلطنت کے

رقبہ کو ایسی حدود تک پہونچایا جو پچھلے حکمرانوں کے زمانہ میں کبھی نہیں پہونچا تھا۔

محمود گواں اس قدر محنت کا عادی تھا کہ وہ اپنا ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرتا۔ اپنی ضرورتیں اس نے بہت محدود کر لی تھیں۔ چٹائی پر سوتا، مٹی کے برتن میں کھانا کھاتا اور نہایت سادہ زندگی گزارتا۔ اس کے ذاتی کتب خانہ میں تین ہزار کتابیں تھیں۔ اس نے بہمنی سلطنت کی راجدھانی بیدر میں ایک مدرسہ قائم کیا اور اپنی تمام کتابیں وہاں بھیج دیں۔ مدرسہ کی عمارت کے آثار اب بھی بیدر میں موجود ہیں۔ اس کے زمانہ میں بہمنی سلطنت کو بہت ترقی ہوئی۔

محمود گواں کے زمانہ میں بہمنی تخت پر محمد شاہ سوم تھا۔ یہ بادشاہ نہایت آرام طلب اور ناکارہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کا سارا انتظام عملاً محمود گواں کے ہاتھ میں آگیا۔ محمود گواں نے اس اقتدار کا کبھی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ پھر بھی دربار کے امراء اس کے قوت و اثر کو دیکھ کر اس سے جلنے لگے۔ انھوں نے خفیہ طریقہ سے محمود گواں کی سرکاری مہر حاصل کر لی۔ اس کے بعد ایک جعلی خط اس کی مہر کے ساتھ تیار کیا جو وجے نگر کے راجہ رائے نرسنگھ کے نام لکھا گیا تھا۔ یہ فرضی خط انھوں نے بادشاہ کو دکھایا اور کہا کہ وزیر غدار ہے۔ وہ بادشاہ کو تخت سے بے دخل کرنے کے لیے وجے نگر کے راجہ کے ساتھ ساز باز کر رہا ہے۔

بادشاہ امیروں کے دھوکے میں آگیا۔ اس نے ۵ اپریل ۱۴۸۱ء کو اس لائق وزیر کو قتل کرا دیا۔ بعد کو بادشاہ کو پتہ چلا کہ اس نے غلطی کی ہے، اس کو بے حد صدمہ ہوا، یہاں تک کہ وہ خود بھی ایک سال کے اندر ۱۲ مارچ ۱۴۸۲ کو مر گیا۔

محمود گواں کے خلاف اس شرمناک سازش کا اصل دماغ ملک نائب تھا۔ مگر محمود گواں کے بعد اس کو بھی چین نصیب نہ ہو سکا۔ اب دربار میں اس کے مخالفین پیدا ہو گیے۔ دوبارہ اس کے خلاف بھی سازش ہوئی اور ۱۴۸۶ میں ملک نائب کو بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔ مقتول کے خاتمہ کے صرف پانچ سال بعد خود قاتل کا بھی ذلت کے ساتھ خاتمہ ہو گیا۔

محمود گواں کے قتل کے بعد بہمنی سلطنت دوبارہ سنبھل نہ سکی۔ ۱۵۲۴ء میں اس کے آخری حکمراں کی وفات کے ساتھ بہمنی سلطنت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد اس علاقہ میں بغاوتیں ہوئیں اور ایک سلطنت پانچ الگ الگ سلطنت میں تقسیم ہو گئی۔

یقینی حل

الرسالہ اکتوبر ۱۹۸۶ کو پڑھ کر ایک صاحب نے طویل خط (۷، اکتوبر ۱۹۸۶) لکھا ہے۔ اس کا ایک حصہ یہ ہے: آپ کا سفرنامہ نہ صرف معلوماتی ہوتا ہے بلکہ انداز بیان کے لحاظ سے بھی منفرد۔ اس بار بھی بمبئی کا سفرنامہ ایسا ہی ہے۔ اس سفرنامہ میں ہیرالال ڈرائیور سے آپ کی ملاقات اور ایکسیڈنٹ سے بچے رہنے کی تدبیر کے بارہ میں پوچھے گیے آپ کے سوال کا جواب پڑھنے کو ملا۔ اور مجھے اس سے ملتا جلتا ایک قصہ یاد آگیا۔

ایک ٹیکسی ڈرائیور نے اپنی ۵۵ سالہ زندگی میں ایک بھی ایکسیڈنٹ نہیں کیا۔ ایک بار وہ محفوظ ڈرائیونگ پر لکچر دیتے ہوئے بولا: مجھے یہ بتانے میں ایک منٹ کا وقت بھی نہیں لگے گا کہ محفوظ ڈرائیونگ کس طرح کی جاتی ہے۔ اس کا طریقہ بہت آسان ہے۔ ڈرائیونگ کے وقت بس یہ بات ذہن میں رکھئے کہ آپ کے سوا دنیا کا ہر ڈرائیور پاگل ہے۔ (محی الدین محمد۔ حیدرآباد)

'پاگل' اس شخص کا نام ہے جو مرفوع القلم ہو۔ جس سے کسی قسم کی توقع نہ کی جاسکے۔ اور جہاں فریق ثانی کی طرف سے کوئی توقع نہ ہو وہاں دوطرفہ بنیاد پر سوچنا بالکل بے معنی ہے۔ ایسے مواقع پر آدمی ہمیشہ یک طرفہ سوچتا ہے۔ اور یک طرفہ طور پر مسئلہ کا حل تلاش کرتا ہے۔ چنانچہ ہر آدمی جانتا ہے کہ پاگل سے لڑنا نہیں ہے بلکہ پاگل سے بچنا ہے۔ پاگل کے مسئلہ کا حل اس سے اعراض کرنا ہے نہ کہ اس سے ٹکراؤ کرنا۔ جو ڈرائیور دوسرے ڈرائیور کو پاگل سمجھ لے وہ دوسروں کی شکایت نہیں کرے گا۔ وہ ساری توجہ خود اپنی طرف لگا دے گا۔ وہ کہیں اپنی گاڑی کو روک لے گا۔ کہیں وہ پیچھے ہٹ جائے گا اور کنارے کی طرف سے اپنا راستہ نکالے گا۔ سڑک کا جو مسافر اس طرح یک طرفہ طور پر ذمہ داری اپنے آپ پر ڈال لے وہ کبھی سڑک کے حادثہ سے دوچار نہیں ہو سکتا۔

مذکورہ ڈرائیور نے ایک لفظ میں زندگی کا راز بتا دیا ہے۔ اس کی مراد دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ ——— آپ دوسروں سے کچھ امید نہ رکھیے ساری ذمہ داری یک طرفہ طور پر

خود قبول کیجیے اور اس کے بعد آپ یقینی طور پر ایکسیڈنٹ سے دوچار نہیں ہوں گے۔

ڈرائیور نے جو بات سڑک پر حادثات سے بچنے کے بارہ میں کہی، وہی وسیع تر زندگی میں حادثات سے بچنے کے بارے میں بھی درست ہے۔ آپ اپنی زندگی میں یقینی طور پر سماجی حادثات سے بچ سکتے ہیں، شرط یہ ہے کہ آپ یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو اس کا ذمہ دار بنالیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ دنیا میں مسائل کا سب سے زیادہ یقینی حل وہی ہے جس پر مذکورہ ڈرائیور نے عمل کیا اور اپنی ڈرائیونگ کی طویل زندگی میں حادثات سے مکمل طور پر محفوظ رہا۔

خالص طبی معنوں میں پاگل انسانوں کی تعداد ساری دنیا میں بمشکل ایک فیصد ہوگی مگر دوسرے اعتبار سے دنیا کے ۹۹ فیصد انسان امکانی طور پر پاگل ہیں۔ عام حالات میں بظاہر لوگ بالکل ٹھیک نظر آتے ہیں۔ مگر جب آدمی کے ذاتی مفاد کا معاملہ آجائے، جب اس کی انا کو ٹھیس لگے۔ جب فریق ثانی کی کسی بات پر اس کے اندر غصہ بھڑک اٹھے۔ جب اس کا سابقہ کسی ایسے شخص سے پڑے جس سے اس کی اَن بَن ہو گئی ہو، تو اس وقت شریف آدمی بھی غیر شریف بن جاتا ہے۔ صحیح دماغ کا انسان بھی پاگل پن پر اتر آتا ہے۔

یہ موجودہ دنیا کی عام حالت ہے۔ اور یہ حالت اس وقت تک باقی رہے گی جب تک دنیا اپنے موجودہ قوانین کے ساتھ باقی ہے۔ ایسی حالت میں مسئلہ کا حل صرف ایک ہے۔ اور وہ وہی ہے جس کی طرف مذکورہ ڈرائیور نے اشارہ کیا۔

ایک بار حیدر آباد سے محبوب نگر جاتے ہوئے خود میرے ساتھ ایک سبق آموز واقعہ پیش آیا۔ ہماری گاڑی تیزی سے سڑک پر دوڑ رہی تھی کہ اچانک ایک بیل سڑک پر آگیا۔ جو صاحب کار کو چلا رہے تھے انھوں نے یہ نہیں کیا کہ بیل کے خلاف احتجاج کریں یا بدستور اپنی گاڑی دوڑاتے رہیں۔ انھوں نے فوراً بریک لگا کر گاڑی کو روکا۔ اور ایک لمحہ رک کر اندازہ کیا کہ بیل کدھر جارہا ہے۔ بیل نے جب سڑک کے آدھے سے زیادہ حصہ پار کرلیا اور یہ واضح ہوگیا کہ وہ مشرق کی طرف جارہا ہے تو انھوں نے اپنی گاڑی مغرب کی طرف گھمائی اور بیل کے کنارے کی طرف سے راستہ نکال کر آگے کے لیے روانہ ہوگیے۔

زندگی کے مسائل ہمیشہ یک طرفہ کارروائی کے ذریعہ حل ہوتے ہیں۔ جو لوگ دو طرفہ بنیاد پر مسئلہ کو حل کرنا چاہیں، موجودہ دنیا میں ان کے لیے اس کے سوا کچھ اور مقدر نہیں کہ وہ بے فائدہ احتجاج کرتے رہیں اور اسی حال میں دنیا سے چلے جائیں۔

اعلان

اسلامی مرکز اور اس کے مختلف شعبوں کے لیے آپ کے مالی تعاون کی سخت ضرورت ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ اپنا تعاون بھیج کر ممنون فرمائیں۔ رقم بھیجتے وقت اس کی مد کی صراحت بھی ضرور فرما دیں

وحید الدین

صدر اسلامی مرکز

سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ۔ نئی دہلی ۱۳

تاریخ کا ایک صفحہ

چودھویں صدی عیسوی میں دو بڑے مسلم حکمراں تھے۔ ایک تیمور لنگ (۱۴۰۵-۱۳۳۶) اور دوسرا بایزید اول (۱۴۰۲-۱۳۸۹) تیمور لنگ سمرقند (وسط ایشیا) میں پیدا ہوا۔ وہ چنگیز خاں کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ بایزید اول اناتولیہ (ترکی) میں پیدا ہوا۔ اس کا دار السلطنت ایڈریا نوپل تھا۔

ان دونوں مسلم حکمرانوں کے درمیان ایک نہایت ہولناک جنگ ہوئی جس کو تاریخ میں جنگ انگورہ (Battle of Angora) کہا جاتا ہے۔ انگورہ موجودہ انقرہ کا انگریزی نام ہے۔ تیمور نے چاہا کہ وہ بایزید کی سلطنت کے ایشیائی علاقہ پر قبضہ کرلے۔ یہاں سے دونوں میں اختلافات پیدا ہوئے۔ دونوں ایک دوسرے کے خلاف کارروائی کرنے لگے۔ بایزید نے تیمور کے دشمنوں کو اپنے یہاں پناہ دی۔ تیمور نے بایزید کے دشمنوں سے تعلق قائم کیا، وغیرہ۔

اس قسم کی کارروائیاں ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ جولائی ۱۴۰۲ میں انگورہ (انقرہ) کے مقام پر دونوں کی فوجیں ایک دوسرے سے ٹکراگئیں۔ دونوں طرف نہایت بہادر لوگ تھے۔ چنانچہ دونوں کے درمیان سخت ہولناک لڑائی ہوئی۔ ایک مورخ کے الفاظ میں گویا دو پہاڑ آپس میں ٹکراگیے۔ دونوں طرف کے تقریباً ڈیڑھ لاکھ آدمی مارے گیے۔ آخر کار بایزید کو شکست ہوئی۔ وہ گرفتار ہوا اور اسی حالت میں اس کا انتقال ہوگیا۔

چودھویں صدی عیسوی میں ساری دنیا میں تیمور اور بایزید کے برابر کوئی طاقتور بادشاہ موجود نہ تھا۔ ان دونوں کے درمیان جنگ چھڑی تو عالم یہ تھا کہ دور تک خون اور لاشوں کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اس ہولناک جنگ کے سلسلہ میں کچھ لوگ تیمور کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں اور کچھ لوگ بایزید کو۔ تاہم ذمہ دار جو بھی ہو، نتیجہ بہرحال ایک تھا۔ وہ یہ کہ اس لڑائی سے عالم اسلام کو شدید ترین نقصان پہونچا۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یورپ جو عثمانی ترکوں کے ذریعہ اسلامی براعظم بننے جارہا تھا، وہ اس باہمی جنگ کے نتیجہ میں عیسائی براعظم بن کر رہ گیا۔

جنگ کا فیصلہ ۲۰ جولائی ۱۴۰۲ کو ہوا۔ بایزید گرفتار ہوگیا۔ تیمور نے اس کو ایک لوہے کے

کٹہرے میں بند کروایا۔ تیمور اپنے سفروں میں اس کٹہرے کو ساتھ ساتھ لے جاتا تھا تاکہ اس کی تشہیر کرے۔ سلطان بایزید اس رسوائی کو برداشت نہ کرسکا۔ گرفتاری کے صرف آٹھ ماہ بعد اس کا انتقال ہوگیا۔ خود تیمور بھی اپنی فتح کے ڈھائی سال بعد اس دنیا سے رخصت ہوکر وہیں چلا گیا جہاں اس نے اپنے مفتوح سلطان کو پہونچایا تھا۔ دنیا میں بظاہر ایک فاتح تھا اور دوسرا مفتوح۔ مگر آخرت نے دونوں کے فرق کو ختم کردیا۔ آخرت میں دونوں یکساں طور پر خدا کے بندے کی حیثیت سے خدا کی عدالت میں پیش کر دیئے گیے۔

تیمور اور بایزید دونوں نہایت بہادر تھے۔ تیمور کی ہیبت مشرقی دنیا پر چھائی ہوئی تھی اور بایزید کی ہیبت مغربی دنیا پر جس نے اسلام کے حدود دریائے ڈینوب (ہنگری) تک پہونچا دیئے تھے۔

اگر ایسا ہوتا کہ تیمور اپنے عمل کا میدان مشرق کو بناتا اور بایزید مغرب کی سمت میں آگے بڑھتا تو وہ دونوں پورے عالم کو اسلام کے سایہ میں لانے کے لیے کافی ہوجاتے۔ مگر آپس کی لڑائی نے اس امکان کو واقعہ بننے نہیں دیا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار نے تیمور کے تذکرے کے ذیل میں لکھا ہے :

> By defeating the Ottoman Sultan Bayezid at Angora (modern Ankara) in 1402 and thus preventing him from extending his domain into Europe, the fall of Constantinople and the death agony of Byzantium were delayed half a century by this Muslim nomad (18/242).

یعنی تیمور نے عثمانی سلطان بایزید کو انگورہ (موجودہ انقرہ) کے مقام پر ۱۴۰۲ میں شکست دی۔ اس طرح اس نے بایزید کو یورپ میں اپنا اقتدار بڑھانے سے روک دیا۔ اس کے نتیجہ میں قسطنطنیہ کی فتح اور بازنطینی سلطنت کا خاتمہ نصف صدی تک کے لیے موخر ہوگیا۔

مسلمان اکثر دوسری قوموں کی شکایت کرتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو جتنے بھی نقصان پہونچے ہیں، سب اپنوں کی وجہ سے پہونچے ہیں۔ مسلمانوں کی آپس کی لڑائیاں مسلمانوں کی بربادی کا سب سے بڑا سبب ہیں، گزرے ہوئے دور میں بھی اور حال کے زمانہ میں بھی۔ مگر تاریخ کا یہی سب سے بڑا سبق ہے جس سے مسلمانوں نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔

شراب اور ترقی میں تضاد

۳ مئی ۱۹۸۰ کا واقعہ ہے۔ ایک ۱۳ سالہ امریکی لڑکی کاری (Cari) کیل فورنیا کی سڑک سے گزر رہی تھی۔ وہ سڑک کے کنارے بائیسکل لین سے چل رہی تھی۔ اس اثنا میں ایک کار پیچھے سے دوڑتی ہوئی آئی۔ وہ کاری سے اتنے زور کے ساتھ ٹکرائی کہ وہ اچھل کر ۲۵ میٹر اوپر فضا میں چلی گئی۔ اس حادثہ کے ایک گھنٹہ کے اندر لڑکی کا انتقال ہوگیا۔ کار کا ڈرائیور گرفتار کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ شراب پیے ہوئے تھا۔

اس طرح کے حادثے امریکہ میں ہر روز بہت بڑی تعداد میں ہوتے رہتے ہیں۔ تازہ اعداد وشمار سے معلوم ہوا ہے کہ امریکہ میں ہر سال تقریباً ۵۰ ہزار کار کے حادثے ہوتے ہیں۔ ان حادثات میں سے نصف وہ ہیں جو شراب نوشی کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ شراب نوشی کے نتیجہ میں ہونے والے سڑک کے حادثات موجودہ امریکہ میں موت کا سبب نمبر ایک ہیں۔

شراب پی کر گاڑی چلانے کے خلاف امریکہ میں حالیہ برسوں میں نیا شعور جاگا ہے۔ اس نئے شعور کی ہیرو ایک عورت ہے، اور وہ وہی ہے جو مذکورہ مقتول لڑکی کاری کی ماں ہے۔ اس کا نام کینڈی لائٹنر (Candy Lightner) ہے۔ کینڈی لائٹنر اس کو برداشت نہ کر سکی کہ اس کی لڑکی کی موت ایک خالی از معنی واقعہ ہو کر رہ جائے۔ چنانچہ اس نے اپنی ملازمت چھوڑ دی۔ اپنی جائداد فروخت کر دی۔ اس نے دوڑ دھوپ کر کے کچھ اور عورتوں کو اپنا ساتھی بنایا۔ اس کے بعد اس نے ایک تنظیم قائم کی جس کا نام مدرس اگینسٹ ڈرنک ڈرائونگ (MADD) تھا۔ اس نے اپنا پورا وقت اور اپنا پورا اثاثہ اس تنظیم کے حوالے کر دیا۔ یہ تنظیم ۱۹۸۰ میں قائم ہوئی۔

کینڈی لائٹنر نے باقاعدہ طور پر ان قوانین کا مطالعہ کیا جو شراب پی کر گاڑی چلانے کی بابت بنائے گیے ہیں۔ اس نے اس سلسلہ میں ہر قسم کی متعلق معلومات اور اعداد وشمار جمع کیے۔ اس نے اخبار، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور نشر واشاعت کے دوسرے تمام ذرائع کو بھر پور طور پر استعمال کیا۔ اس نے امریکی عوام کو بتایا کہ ہر سال ۲۵ ہزار امریکی محض شراب نوش ڈرائیوروں

کے ذریعہ ہونے والے حادثات میں مر جاتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ ایک ملین امریکی جو حادثات میں مرنے سے بچ جاتے ہیں وہ بھی ہمیشہ کے لیے ناقابل کار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ امریکہ میں ہر روز ۷۰ آدمی سڑک کے حادثات میں مرتے ہیں یعنی ہر ۲۰ منٹ میں ایک آدمی۔ اس قسم کی بے شمار باتوں سے کینڈی لائٹنر نے امریکی عوام کو بوکھلا دیا۔ یہاں تک کہ خود امریکی حکومت حرکت میں آگئی۔ ۱۷ جولائی ۱۹۸۴ کو صدر ریگن نے شراب پی کر گاڑی چلانے کے خلاف ایک قانون پر دستخط کر دیے۔

اس مسئلہ کی تفصیلی معلومات دیتے ہوئے ایک امریکی میگزین *Span*, September 1986 نے لکھا ہے کہ ۲۰ ویں صدی تک شراب نوشی امریکہ میں نسبتاً چھوٹا سماجی مسئلہ تھی۔ کیوں کہ شراب پینے والے شاذونادر ہی اس پوزیشن میں ہوتے تھے کہ وہ اپنے آپ کے سوا کسی اور کو کوئی سخت نقصان پہونچا سکیں۔ شراب پینے والے اس سے پہلے زیادہ سے زیادہ شراب خانہ میں چیختے چلاتے تھے یا گھر کے اندر جھگڑا برپا کرتے تھے یا گھوڑا گاڑی دوڑاتے ہوئے اس کو الٹ دیتے تھے۔ اس وقت ایک شراب نوش زیادہ تر رحم کا مستحق سمجھا جاتا تھا نہ کہ نفرت کا۔ وہ یقینی طور پر ایسا مسئلہ نہ تھا جو حکومت کے لیے قابل توجہ ہو۔ مگر موٹروں کی ایجاد نے شراب نوشی کو ہر اس آدمی کے لیے خطرہ بنا دیا جو سڑک پر سفر کرنا چاہتا ہو:

> Until the 20th century, drunkenness was a relatively minor social problem in the United States, because drunkards were rarely in any position to cause serious damage to anyone but themselves. Drinkers might brawl in the bars and public houses, or cause family strife, or upset an applecart on a wild horseback ride through town, but for the most part a chronic drinker was more to be pitied than scorned, and certainly was not cause for government concern. With the introduction of the automobile, however, the drunkard became a menace to everyone within reach of his desire to travel.

شراب نہ پینا مذہب کی علامت ہے اور شراب پینا لامذہبیت کی علامت۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو مذکورہ مثال یہ ثابت کرتی ہے کہ لامذہبیت اور ترقی دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ مذہب کے مخالفین یہ کہتے رہے ہیں کہ مذہب اور ترقی دونوں ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ لامذہبیت ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے نہ کہ مذہبیت۔

۳۰ مارچ ۱۹۸۱ کو صدر امریکہ مسٹر رونالڈ ریگن پر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ وہ زخمی ہوئے تاہم ہلاک ہونے سے بچ گئے۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ قاتل شراب پیے ہوئے تھا۔ مزید تحقیقات نے ثابت کیا ہے کہ شراب اور جرم میں بہت گہرا ربط ہے۔ اکثر مجرم شراب پی کر مجرمانہ فعل کرتے ہیں۔ انسان کا اندرونی ضمیر، اور جرم کے بعد قانون کی پکڑ کا اندیشہ آدمی کو جرم سے روکتا ہے۔ اس لیے منصوبہ کے تحت جرم کرنے والے لوگ ہمیشہ شراب پی کر مجرمانہ اقدام کرتے ہیں، شراب آدمی کے نازک احساسات کو وقتی طور پر دبا دیتی ہے، اس طرح آدمی اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ بے خوف ہو کر مجرمانہ اقدام کر سکے۔

امریکہ میں آج کل بہت سے ممتاز افراد شراب کے خلاف جہاد (کروسیڈ) جاری کیے ہوئے ہیں۔ ان میں امریکہ کی خاتون اول (First Lady) مسز نینسی ریگن بھی شامل ہیں۔ پلین ٹروتھ (اکتوبر ۱۹۸۶) کی رپورٹ کے مطابق مسز ریگن نے کیلی فورنیا میں تقریر کرتے ہوئے شراب کے نقصانات گنائے اور کہا کہ شراب نوشی کے اثرات سے ہم بُری طرح متاثر ہوئے ہیں۔ کیونکہ شراب نوشی اور جرم کے درمیان قطعی اور براہ راست رشتہ پایا جاتا ہے:

It affects us when it destroys families. It affects us when it costs hundreds of millions of dollars through accidents and absenteeism in the workplace. It affects us since there is a definite and direct link between crime and drug abuse.

مسز ریگن نے مزید کہا کہ یہ ایک اخلاقی مسئلہ (Moral issue) ہے۔ اس کے متعلق ہمیں ایک فیصلہ کرنا ہوگا۔ آپ خواص کی کم مقدار میں شراب نوشی اور عوام کی زیادہ مقدار میں شراب نوشی کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے۔ دونوں ہی بُرائی ہیں۔ اخلاقی اعتبار سے دونوں کی حیثیت یکساں ہے:

You cannot separate polite drug use at a chic L.A. party from drug use in some back alley somewhere. They are morally equal.

اسلام میں یہ تعلیم دی گئی تھی کہ ہر نشہ آور چیز حرام ہے، اور یہ کہ جس چیز کی زیادہ مقدار نشہ پیدا کرے اس کی کم مقدار بھی حرام ہے (ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام)، تہذیب جدید

اپنی ترقی کی آخری انتہا پر پہونچ کر حیرت انگیز طور پر اس دینی تعلیم کی صداقت کا اقرار کر رہی ہے۔

کیسی عجیب ہے یہ تصدیق، اور کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو اس کھلی ہوئی تصدیق کے باوجود دینی تعلیمات کی ابدی صداقت کا اعتراف نہ کریں۔
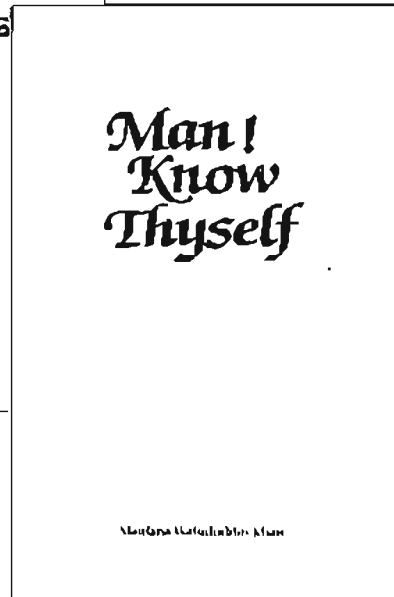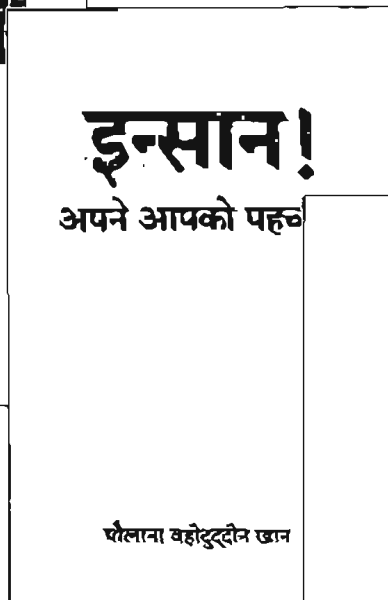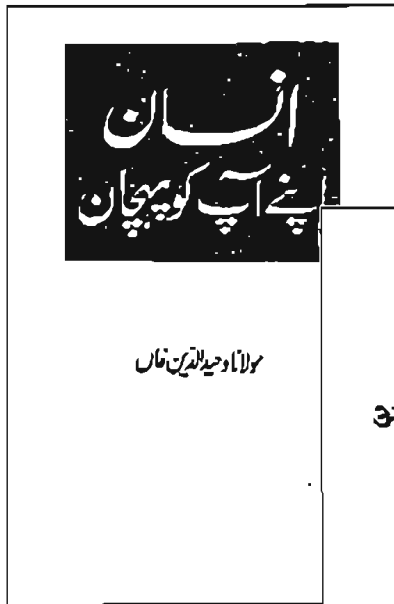
ایک سفر

ایک عالمی اسلامی کانفرنس (۱۵ ستمبر تا ۲۰ ستمبر ۱۹۸۶) میں شرکت کے لیے افریقہ کا سفر ہوا۔ یہ سفر میرے تمام سفروں میں سب سے زیادہ واقعات سے بھرا ہوا (Eventful) سفر تھا۔ اگر اس کی تمام باتیں لکھی جائیں تو شاید پورا الرسالہ بھر جائے گا۔ تاہم میں اس کی مختصر روداد بیان کروں گا۔ ۱۲ ستمبر کی شام کو دہلی کے نئے ہوائی اڈہ (اندرا گاندھی انٹرنیشنل ایرپورٹ) پہونچا۔ جدید طرز کا یہ ایرپورٹ دو ہزار ہیکٹیر رقبہ میں بنایا گیا ہے۔ اس کا اضافہ شدہ بجٹ ۱۰۰ کروڑ روپیہ تھا۔ اگرچہ اس کی آخری تکمیل ابھی باقی ہے۔ تاہم اس کا رسمی افتتاح یکم مئی ۱۹۸۶ کو کیا گیا ہے۔

اب پالم کا قدیم ہوائی اڈہ ملک کی اندرونی پروازوں کے لیے خاص کر دیا گیا ہے۔ نیا ہوائی اڈہ جب آخری طور پر مکمل ہو گا تو وہ سالانہ ۲۵ ملین مسافروں کو چڑھا اور اتار سکے گا۔ یہاں بیک وقت ایک سو ہوائی جہازوں کے کھڑے ہونے کے لیے جگہ ہو گی۔ نئے ہوائی اڈہ کی بلڈنگ اور اس کا نظام جدید بین اقوامی معیار پر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ اتنا بڑا ہے کہ یہاں بیک وقت ۱۴ جہاز اتر سکتے ہیں یا روانہ ہو سکتے ہیں۔ پانی کے معقول انتظام کے لیے ۲۴ ٹیوب ویل لگائے گیے ہیں۔ سامان منتقل کرنے کی پٹی (Conveyer belt) کو جدید طرز کا بنایا گیا ہے تاکہ مسافروں کو اپنا سامان لینے کے لیے کم سے کم انتظار کرنا پڑے۔ قدیم ہوائی اڈہ پر صرف ۲۲ کاونٹر تھے۔ یہاں ۸۰ کسٹم کاونٹر بنائے گیے ہیں۔ ٹیلی فون کی ۵۰۰ لائنیں ہیں جو الکٹرانک سسٹم پر قائم ہیں۔ یہاں مشینی زینہ (Escalator) لگایا گیا ہے۔ ہوائی جہاز پر چڑھنے اور ہوائی جہاز سے اترنے کے لیے اس سے پہلے قدیم طرز کی سیڑھی (Tarmac) ہوتی تھی۔ اب جدید طرز کے معلق پل (Aero-bridge) بنائے گیے ہیں جو جہاز کے دروازہ سے جوڑ دیئے جاتے ہیں۔ وغیرہ۔ تاہم کھلی سیڑھی سے چڑھنے اترنے میں جو رومانی منظر ہوتا ہے وہ بند قسم کے ایروبرج سے چڑھنے اور اترنے میں موجود نہیں۔ نیز کارکردگی کے اعتبار سے صورت حال زیادہ اطمینان بخش نہیں۔ مثلاً اندرا گاندھی ایرپورٹ سے ہم نے اپنے دفتر میں ٹیلی فون کرنا چاہا۔ مگر بار بار نمبر ملانے کے باوجود ایسا ہوا کہ دوسری طرف سے "ہلو" کی آواز آتی تھی۔ مگر ہماری آواز انھیں

بالکل سنائی نہیں دیتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کافی کوشش کے باوجود گفتگو نہ ہو سکی۔

اس ایرپورٹ پر جو خصوصی اہتمام کیے گیے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایرپورٹ کی دیواروں پر ہندستان کی ہوا بازی کی کہانی مصور کی گئی ہے۔ یہ تصویر کشی انتہائی اعلیٰ مصوروں نے کی ہے، مثلاً ایم ایف حسین اور کے کھیم راج۔ اس میں دلچسپ بات یہ ہے کہ ہندستانی ہوا بازی کی کہانی کا آغاز دیو مالائی قصوں سے کیا گیا ہے جب کہ دیوتا اپنے پشپ ویمان (Flowercraft) میں سوار ہو کر سفر کرتے تھے اور اس کا آخری منظر اس مرحلہ پر ختم ہوتا ہے جب کہ سٹلائٹ اور کمپیوٹر ہوابازی کے عمل میں اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ (ٹائمس آف انڈیا ۲۵ اکتوبر ۱۹۸۵)

ماضی پرستی کے ساتھ مستقبل پسندی کی اسی ذہنیت پر اقبال احمد سہیل مرحوم نے یہ شعر کہا تھا:

آگے ہیں قدم پیچھے ہے نظر جانا ہے کہاں جاتے ہیں کدھر مبہم ہے یہاں خود سمت سفر نیرنگ زمانہ کیا کہیے

اندرا گاندھی انٹرنیشنل ایرپورٹ پر آرٹ ورک کا کام اعلیٰ پیمانہ پر کیا گیا ہے۔ اس آرٹ ورک کے لیے ابتداءً تین لاکھ روپے کی منظوری دی گئی تھی مگر "ماہرین" نے حکومت کو مطلع کیا کہ تین لاکھ روپیہ پیش نظر کام کے لیے بہت ناکافی ہے۔ اس کے بعد حکومت نے زبردست فیاضی کا ثبوت دیتے ہوئے تین ملین (۳۰ لاکھ) روپے اس کے لیے منظور کر دیے۔

اس ۳۰ لاکھ روپے کے منصوبہ کا ٹھیکہ لینے کے لیے بہت سے امیدوار دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔ مگر اس کا ٹھیکہ جس کو ملا وہ مشہور مسلم آرٹسٹ ایم۔ ایف حسین تھے۔ مسٹر حسین کو ٹھیکہ ملنے کی وجہ ان کی فنی مہارت کے علاوہ یہ بھی تھی کہ پہلے انھیں ایرپورٹ کا ایک جزئی کام دیا گیا تھا جس کو انھوں نے وقت سے کافی پہلے مکمل کر دیا (ہندستان ٹائمس ۳ دسمبر ۱۹۸۵)

آدمی اگر کسی اعتبار سے امتیازی کارکردگی کا مقام حاصل کرے تو وہ تعصب اور تنگ نظری سے بلند ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنا اعتراف پا کر رہتا ہے، خواہ وہ ایک فرقہ کا آدمی ہو یا دوسرے فرقہ کا۔

افریقہ کا یہ سفر براستہ کراچی ہوا۔ دہلی سے کراچی تک کا سفر پی آئی اے کے ذریعہ طے ہوا۔ جہاز کے اندر پی آئی اے کا میگزین ہم سفر (ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۸۶) دیکھنے کو ملا۔ اس کا نصف حصہ اردو زبان میں تھا اور نصف حصہ انگریزی زبان میں۔ جہاز کے اعلانات کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اور قرآن کی آیت (سُبحانَ الّذی سَخّرلَنا ھٰذا وَمَا کُنّا لہٗ مُقرِنِین) سے ہوا۔ درمیانی اعلانات میں بھی ہمیشہ انشاء اللہ کا لفظ شامل رہتا تھا۔ کیپٹن وقار اس کے پائلٹ تھے۔ جہاز کے اندر کا نظام دوسری کئی ہوائی کمپنیوں سے بہتر نظر آیا۔

کراچی سے جہاز بدلنا تھا۔ یہاں دو رات اور ایک دن قیام رہا۔ کراچی میں میرا قیام ایرپورٹ ہوٹل میں تھا۔ یہ ہوٹل پی آئی اے نے اپنے ٹرانزٹ مسافروں کے لیے بنایا ہے۔ وسیع ہوٹل کے اندر ایک چھوٹی سی بغیر چھت کی مسجد بھی موجود تھی۔ وہ شاندار ہوٹل کے اندر غیر شاندار حالت میں نظر آئی۔ تاہم واپسی کے بعد جب میں دوبارہ ۲۳ ستمبر کو اس ہوٹل میں پہونچا تو معلوم ہوا کہ یہ مسجد دراصل زیر تعمیر تھی۔ چنانچہ واپسی میں وہ اپنی دیوار اور چھت کے ساتھ مکمل کھڑی ہوئی نظر آئی ـــــــ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی سرسری مشاہدہ کی بنیاد پر ایک رائے قائم کر لیتا ہے جس کی تصدیق بعد کے مشاہدہ سے نہیں ہوتی۔

کراچی ایرپورٹ پر ایرپورٹ کے شایان شان چھوٹی سی خوبصورت مسجد موجود تھی۔ یہاں ہم نے سکون کے ساتھ فجر کی نماز ادا کی۔

پچھلے پندرہ سال سے ایک عجیب وغریب عمل ساری دنیا میں جاری ہے جس کو فضائی قذاقی (Hijacking) کہا جاتا ہے۔ ۱۲ ستمبر کی شام کو میں کراچی ایرپورٹ پر اترا تو اس سے صرف چند دن پہلے (۵ ستمبر ۱۹۸۶) کو پان ایم کی فلائٹ ۷۳ کے ساتھ اسی قسم کا ایک دہشت خیز واقعہ یہاں ہو چکا تھا۔ آج کل ہوائی اڈوں پر مسافروں کی زبردست چیکنگ ہوتی ہے۔ اس کے باوجود کیسے ممکن ہوتا ہے کہ لوگ آتشیں ہتھیار لے کر ہوائی جہازوں کے اندر داخل ہو جائیں، یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہ آسکی۔ اگر چیکنگ کا موجودہ نظام اس کو روکنے کے لیے ناکافی ہے تو پھر ہزاروں بے قصور مسافروں کو اس سخت عمل سے گزارنے کا جواز کیا ہے جس کو سیکورٹی چک کہا جاتا ہے۔ کیا اس کا مقصد یہ ہے کہ گنہ گاروں کی سزا بے گناہوں کو دی جائے۔

فضائی قذاقی سے نمٹنا ایک بے حد نازک کام ہے۔ کسی ملک کی مسلح پولس ہوائی جہاز کے اندر داخل ہو کر ان کو چند منٹ میں ہلاک کر سکتی ہے۔ مگر نزاکت یہ ہے کہ فضائی قذاقوں کے ہاتھ میں خطرناک ہتھیار ہوتے ہیں۔ جب ان پر وار کیا جائے گا تو وہ بھی ضرور اپنا ہتھیار استعمال کریں گے

اور اس دوطرفہ جنگ میں بے گناہ مسافر مارے جائیں گے ، جیساکہ کراچی کے ہوائی اڈہ پر پان ایم کے جہاز کے ساتھ عملاً پیش آیا۔ اس جہاز میں چار سو مسافر تھے ان میں سے ڈیڑھ درجن آدمی مرگیے اور تقریباً ڈیڑھ سو آدمی زخمی ہوئے ۔ (ٹائم میگزین ۱۵ ستمبر ۱۹۸۶)

چنانچہ فضائی قذاقی سے نمٹنے کے لیے کچھ مسلمہ اصول (Accepted rules) ہیں ۔ جن کا خلاصہ ان مختصر الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے ——— گفت وشنید کرو ، گفت وشنید کرو، گفت وشنید کرو ، وقت حاصل کرو ، وقت حاصل کرو ، وقت حاصل کرو :

Negotiate, negotiate, negotiate, negotiate.
Buy time, buy time, buy time, buy time.

مسئلہ جتنا زیادہ نازک ہو ، اتنا ہی زیادہ حکمت کے ساتھ اس سے نپٹنا پڑتا ہے ۔ اگرچہ نادان آدمی نازک مسئلہ اور غیر نازک مسئلہ کے فرق کو نہیں سمجھتا۔ وہ دونوں سے یکساں انداز سے نپٹنے کی کوشش کرتا ہے ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ صرف مسائل میں اضافہ کا سبب بنتا ہے ، وہ کسی درجہ میں بھی مسئلہ کو کم نہیں کرتا ۔

کراچی کے ہوٹل میں کھانے کے وقت ایک بار ایک پٹھان ہماری میز کے دوسری طرف آکر بیٹھ گیا ۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ سرحد کے رہنے والے ہیں ۔ اور ابوظبی سے آرہے ہیں ۔ میں نے پوچھا کہ آپ ابوظبی میں کیا کام کرتے ہیں ۔ انھوں نے کہا کہ "مزدوری" ۔ اس کے بعد انھوں نے میرے بارہ میں سوالات پوچھنا شروع کیے ۔ جب میں نے بتایا کہ میں ہندستان کا رہنے والا ہوں اور افریقہ جارہا ہوں ، تو انھوں نے کہا :

افریقہ میں کیا کرتے ہو ، کیا وہاں مزدوری کرتے ہو ۔

اس سوال پر میں خاموش رہا اور ان کو کوئی جواب نہیں دیا ۔ میں نے سوچا کہ آدمی جس طبقہ کا ہو ، اسی طبقہ کے مطابق اس کا فکر بھی بنتا ہے ۔ اپنے قریبی حالات سے اوپر اٹھ کر سوچنا نہایت نادر خصوصیت ہے ۔ حتی کہ خواص بھی اس معاملہ میں اتنا ہی پیچھے ہیں جتنا کہ عوام ۔

ہوائی جہاز کا سفر بے حد نازک سفر ہے ۔ کسی بھی لمحہ کوئی ہنگامی صورت پیش آسکتی ہے جو واقعات کے رخ کو تبدیل کردے ۔ ہم کراچی سے روانہ ہوئے ۔ ابتداءً یہ نہایت ہموار پرواز تھی ۔ سات گھنٹہ

کی مسلسل اڑان کے بعد ہم کو منزل پر پہونچنا تھا۔ مگر چند گھنٹہ کے بعد خطرے کا الارم بجنے لگا۔ پھر اعلان ہوا کہ بعض "ٹکنکل سبب" کے تحت جہاز درمیان میں اتارا جا رہا ہے۔ دوران پرواز پائلٹ نے عمان ایرپورٹ سے رابطہ قائم کیا اور اس سے اجازت لے کر جہاز کو نیچے اتارنا شروع کیا، یہاں تک کہ وہ عمان کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ جیسے ہی جہاز کے پہیے نے زمین کو چھوا، مسافروں نے خوشی کے اظہار کے طور پر تالیاں بجائیں۔ کیوں کہ یہ بھی ممکن تھا کہ جہاز ہوائی اڈہ پر اترنے کے بجائے کسی کھڈ میں جا گرے۔

عمان (اردن) میں ہم ساڑھے سات گھنٹہ تک رکے رہے۔ جہاز کے ایک انجن نے کام کرنا بند کر دیا تھا۔ انجینیروں نے مسلسل محنت کرکے اس کو درست کیا، اس کے بعد جہاز دوبارہ آگے کے لیے روانہ ہوا۔

تقریباً دو سو مسافر عمان کے ہوائی اڈہ پر پہونچا دیے گئے۔ عمان کا ہوائی اڈہ چھوٹا مگر خوبصورت ہے۔ یہاں ہم نے دو نمازیں پڑھیں، ایک ظہر کی اور دوسری عصر کی۔ میں نے دیکھا کہ مسافروں کی اکثریت یا تو باتیں کر رہی ہے یا سگریٹ کا دھواں اڑانے میں مشغول ہے۔ کوئی چپ کی دنیا میں مشغول ہونے والا نظر نہ آیا۔ جن لوگوں کے پاس اپنے آپ سے باتیں کرنے کے لیے کچھ نہ ہو وہ بیرونی کلام میں مشغول ہوتے ہیں۔ جن کو اپنے اندر سفر کرنے کے لیے راستہ نہ ملے، وہ باہر کے راستوں پر دوڑتے ہیں۔

عمان کے ساڑھے سات گھنٹے بڑے سخت گزرے۔ بظاہر وہاں کوئی تکلیف نہ تھی۔ کھانے پینے کا انتظام بھی موجود تھا۔ آرام دہ نشستیں تھیں جن پر کوئی بیٹھا تھا اور کوئی لیٹا ہوا تھا۔ ضروریات کا تمام سامان مہیا تھا۔ مگر مجھ پر اَلانتظارُ اَشدُّ مِنَ الموتِ کی کیفیت طاری تھی۔ میں نے کہا: خدایا، عاجز انسان خیالی تکلیف کو بھی برداشت نہیں کر سکتا، پھر آخرت میں وہ حقیقی تکلیف کو کس طرح برداشت کرے گا۔

عمان کے ہوائی اڈہ پر بڑے بڑے فریموں میں تاریخی آثار (الکرک، جرش، عقبہ، موتہ وغیرہ) کی تصویریں کثرت سے لگی ہوئی تھیں۔ موجودہ اردن کی تجارتی یا تمدنی اعتبار سے کوئی اہمیت نہیں۔ مگر تاریخی اعتبار سے وہ زبردست اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں سیاح کثرت سے تاریخی آثار

کو دیکھنے کے لیے آتے رہتے ہیں۔

عمان اردن کی راجدھانی ہے۔ جون ۱۹۶۷ میں عرب۔ اسرائیل جنگ ہوئی تھی۔ اس جنگ میں اسرائیل نے دوسرے علاقوں کے علاوہ، دریائے اردن کا مغربی حصہ اور یروشلم کا اردنی سکٹر اپنے قبضہ میں لے لیا تھا۔ اسرائیل کے اس زیر قبضہ علاقہ کا رقبہ ۲۲۰۰ مربع میل ہے، یعنی اردن کے پورے رقبہ کا ۶ فی صد۔ اس مقبوضہ علاقہ میں اردن کا تقریباً نصف قابل زراعت حصہ شامل ہے۔ اردن میں ۳۰۰۰ سال قبل مسیح کے آثار پائے جاتے ہیں۔

۱۴ ستمبر کی شام کو ہم طرابلس پہونچے۔ یہاں کے وقت اور ہندستان کے وقت میں ساڑھے تین گھنٹہ کا فرق ہے۔ طرابلس کا لفظ ٹرپولی (Tripoli) کی تعریب ہے۔ اور ٹرپولی ٹرائی پولس (Tripolis) سے بنا ہے۔ یہ نام اس کو ابتداءً فینقیوں نے دیا تھا۔ Tri کا مطلب یونانی اور لاتینی میں تین ہوتا ہے۔ ٹرائی پولس کے معنی تین شہر کے ہیں۔ یہی لفظ بعد کو انگریزی میں ٹریپولی ہوگیا۔ یہ شہر ساتویں صدی قبل مسیح میں فینقیوں (Phoenicians) نے بسایا تھا۔ اس کے بعد وہ رومیوں کے قبضہ میں آیا۔ انھوں نے بھی یہ نام باقی رکھا۔ فینقیوں کا یہ طریقہ تھا کہ وہ شہر کو تین حصے کی صورت میں آباد کرتے تھے، اور اس بنا پر اس کا نام تین شہر (ٹرائی پولس) رکھتے تھے۔

یہاں میرا قیام فندق باب البحر (کمرہ نمبر ۵۱۹) میں تھا۔ یہ ہوٹل سمندر (میڈیٹرینین) کے عین کنارے بنایا گیا ہے۔ کمرہ کے ایک طرف سمندر کی لہریں حد نظر تک پھیلی ہوئی نظر آتی تھیں۔ یہاں قدرت کی اتھاہ خاموشی کو صرف وہ مشینیں توڑتی تھیں جو صبح سویرے سے اپنے کام میں لگ جاتی تھیں۔ ان کا کام تھا، سمندر کے ساحلی حصہ کو پاٹ کر خشک زمین میں تبدیل کرنا تاکہ وہاں تعمیرات کھڑی کی جاسکیں۔

قدیم ترین زمانہ میں آدمی خشکی پر سفر کرتا تھا، پھر اس نے کشتی اور جہاز بنائے اور سمندروں کے ذریعہ زیادہ آسانی کے ساتھ دور دور کا سفر کیا جانے لگا۔ اب انسان فضا میں مزید تیز رفتاری کے ساتھ ہوائی جہازوں کے ذریعہ سفر کرتا ہے۔

ان چیزوں کو مورخین انسانی ترقی کے عنوان کے تحت بیان کرتے ہیں۔ مگر ان کو آلاء اللہ کے عنوان کے تحت بیان کیا جانا چاہیے۔ یہ دراصل خدا ہے جو انسان کو سفر کراتا ہے۔ خشکی اور سمندر اور

فضا کو اللہ تعالیٰ نے مخصوص قوانین کا پابند بنایا ہے۔ اگر یہ قوانین نہ ہوں یا وہ انسان کے ساتھ موافقت نہ کریں تو انسان خشکی میں بھی سفر نہیں کر سکتا، کجا کہ وہ سمندروں میں تیرے اور فضاؤں میں اڑے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے: سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَمَا کُنَّا لَہٗ مُقْرِنِیْنَ۔

سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر خدا کی عظمت کا بڑا پر رعب احساس ہوتا ہے۔ پانی کا اتھاہ خزانہ، ساحل سے ٹکراتی ہوئی موجیں، حد نظر تک پھیلا ہوا آسمان۔ یہ چیزیں آدمی کے جسم کے رونگٹے کھڑے کر دیتی ہیں۔ اس پر عظمت منظر کو دیکھتے ہوئے میری زبان سے نکلا: بنانے والے نے کیسی عجیب دنیا بنائی، ایک ایسی دنیا جو دہشت ناک حد تک عجیب ہے۔

ایک وسیع ہال میں باجماعت نماز کا انتظام تھا۔ بعض باتیں ایسی ہیں کہ ایک مانوس ماحول میں بار بار اس کو سنا جائے تو آدمی اس کا عادی ہو جاتا ہے۔ مگر وہی بات ایک غیر مانوس ماحول میں سننے کو ملے تو وہ آدمی کو غیر معمولی طور پر متاثر کرتی ہے۔ یہ ہال جس کے ایک طرف سمندر کا منظر تھا اور دوسری طرف نمازیوں کے چہرے۔ اس ماحول میں ایک شخص نے کھڑے ہو کر عربی لہجہ میں فجر کی اذان دی:

اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ، اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ، اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ، حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ، اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ،

یہ فجر کا اول وقت تھا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایسے ماحول میں جب یہ پر شکوہ الفاظ گونجے تو دل کی عجیب کیفیت ہوئی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے مؤذن کی آواز کائنات کی ہم نوا ہو گئی ہے، جیسے مؤذن عالم گیر سناٹے کو توڑتے ہوئے اس حقیقت کا اعلان کر رہا ہے جس کے اعلان کے لیے سارے زمین و آسمان بے قرار ہو رہے تھے۔

کانفرنس میں ایک مقرر نے نماز سے متعلق حضرت عمرؓ کا واقعہ بیان کیا۔ اس کے بعد اس نے نہایت پر جوش انداز میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ یہاں ہوٹل میں ایک ہال کو مسجد کے طور پر مخصوص کیا گیا ہے۔ وہاں روزانہ اذان ہوتی ہے، مگر میں دیکھتا ہوں کہ جب اذان کی آواز بلند ہوتی ہے تو بہت کم لوگ ہیں جو مسجد کی طرف دوڑ کر جاتے ہوں، مگر خود مقرر صاحب

کا یہ حال تھا کہ پروگرام کے تحت ہونے والی نمازوں (مثلاً مغرب) میں تو وہ مسجد میں نظر آتے تھے۔ مگر اس کے بعد ان کو مسجد میں پانا بہت مشکل تھا۔ چنانچہ میں نے ان کو نہیں دیکھا کہ وہ کبھی فجر کی جماعت میں شریک ہوئے ہوں، یہاں مغرب کی جماعت میں سب سے زیادہ آدمی ہوتے تھے اور فجر کی جماعت میں سب سے کم۔

اس کانفرنس میں تقریباً ۸۵ ملکوں کے ۴۰۰ علمار اور دانشور شریک ہوئے۔ کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے صدر جلسہ نے کہا:

نحن هنا من كل انحاء العالم الاسلامي بل من كل انحاء العالم

یہ کانفرنس دعوت اسلامی کے موضوع پر تھی۔ یہی ایک جذبہ لے کر ہر شخص اس میں شریک ہوا تھا کہ اسلام کی دعوت کو از سر نو زندہ اور غالب کیا جائے۔ مگر یہاں اور دوسرے مواقع پر گفتگو کے بعد میرا تاثر یہ ہے کہ اس وقت ساری دنیا میں مسلمان ایک ہی قسم کے ذہنی انتشار سے دوچار ہیں۔ اور وہ یہ کہ وہ دعوت اسلام اور دفاع اسلام کو الگ الگ کرکے دیکھ نہیں پاتے۔ وہ دعوت کے عنوان پر بولنا شروع کرتے ہیں اور اس کے بعد جلد ہی دفاع کے موضوع پر پہونچ جاتے ہیں اور پھر تقریر کی پوری ٹرین دفاع کے موضوع پر چلتی رہتی ہے اور اسی پر ختم ہو جاتی ہے۔

یہاں کئی ایسے لوگ ملے جو الرسالہ (انگریزی) کے قاری تھے۔ ہر ایک نے غیر معمولی الفاظ میں اس کی زبان و بیان کی خوبیوں کا اعتراف کیا۔ ایک امریکی نومسلم سے میں نے الرسالہ (انگریزی) کے بارہ میں ان کا تاثر پوچھا تو وہ بار بار ممتاز ممتاز (Excellent, Excellent) کہتے رہے۔

افریقہ میں جو لوگ الرسالہ (انگریزی) کا افریقی اڈیشن نکال رہے ہیں، ان میں سے ایک صاحب یہاں آئے ہوئے تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ افریقہ میں الرسالہ (انگریزی) کی مقبولیت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ لوگ بہت شوق سے اس کا مطالعہ کر رہے ہیں۔

میرا مقالہ ۱۶ ستمبر ۱۹۸۶ کی نشست میں تھا۔ یہ مقالہ عربی میں تھا اور اس میں دکھایا گیا تھا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے پچھڑے پن کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے آج کے دور میں اپنی نفع بخشی کھودی ہے۔ خدا کا قانون اس دنیا کے لیے یہ ہے کہ جو شخص یا گروہ اپنے آپ کو نفع بخش ثابت کرے اس کو عزت اور استحکام ملے۔ مسلمان جب تک اپنے آپ اس قانون کا مصداق ثابت

نہ کریں وہ بلند مقام حاصل نہیں کر سکتے۔ یہ مقالہ (اسلام دور جدید میں) انشاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دیا جائے گا۔ یہ مقالہ کانفرنس کی طرف سے تین زبانوں میں تقسیم کیا گیا ——— عربی، انگریزی، فرانسیسی۔

یہ عالمی موتمر ۱۵ ستمبر سے ۲۰ ستمبر تک جاری رہی۔ موتمر کی صورت یہ تھی کہ مختلف اہل علم کو پیشگی طور پر متعین موضوعات بھیج دیئے گئے تھے۔ میرے محاضرہ کا عنوان تھا:

حاجة المسلمين الى الاخذ باسباب التقدم العلمي والتقني

ہر نشست میں ضروری رسمی کارروائیوں کے بعد محاضر اپنا محاضرہ پیش کرتا۔ اس کے بعد لوگوں کو اظہار خیال کا موقع دیا جاتا۔ آخر میں محاضر لوگوں کے سوالات کا جواب دیتا۔ میرے محاضرہ میں ایک بات یہ کہی گئی تھی کہ توحید اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ توحید کو ماننے ہی کے نتیجہ میں ہمارے اسلاف نے بڑے بڑے سائنسی کارنامے انجام دیئے۔ اس پر ترکی کے ایک پروفیسر نے سوال کیا کہ توحید میں اور سائنسی ترقیوں میں کیا تعلق ہے۔

میں نے کہا کہ توحید محض ایک رسمی عقیدہ نہیں، وہ ایک ذہنی و فکری انقلاب ہے، بلکہ سب سے بڑا فکری انقلاب ہے۔ اور یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ تمام علمی ترقیاں ذہنی انقلاب ہی کے ذریعہ پیدا ہوتی ہیں۔ ذہنی انقلاب آدمی کی پوری شخصیت کو جگا دیتا ہے۔ اس کی تمام سوئی ہوئی صلاحیتیں بروئے کار آجاتی ہیں اور اسی کے نتیجہ کا نام علمی ترقی ہے۔ ہمارے اسلاف کے لیے توحید ایک عظیم ذہنی انقلاب تھی، اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ اس قابل بنے کہ ہر قسم کی اعلیٰ ترین ترقیاں حاصل کریں۔ مسلمانوں کی موجودہ نسل کے لیے توحید محض ایک رسمی عقیدہ ہے اس لیے وہ جدید دنیا میں کوئی بڑا کارنامہ بھی انجام نہ دے سکے۔

محاضرات کے علاوہ دعوت اور احوال مسلمین کے بارے میں مختلف تجویزیں پیش کی گئیں۔ مختلف ملکوں میں اسلامی دعوت کی صورت حال کا جائزہ لیا گیا۔ اور اس کی روشنی میں پروگرام بنائے گئے۔

۱۸ ستمبر ۱۹۸۶ کی نشست میں راقم الحروف کو صدر (رئیس الجلسہ) بنایا گیا۔ ایک عربی مجلہ نے میرا تفصیلی انٹرویو لیا جو اس کی کسی اگلی اشاعت میں شائع ہوگا۔ بعض اور جرائد انٹرویو

لینا چاہتے تھے، مگر میں اس کے لیے وقت نہ نکال سکا۔ ٹیلی وژن پر مجھ سے انٹرویو دینے کے لیے کہا گیا، مگر میں ان کی اس فرمائش کو بھی پورا نہ کر سکا۔

مسائل کے مطالعہ میں ایک عام غلطی یہ کی جاتی ہے کہ حقیقی باتوں اور غیر حقیقی باتوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاتا۔ اس کے نتیجہ میں پورا مطالعہ غلط ہو جاتا ہے۔ مثلاً نائجیریا کی خاتون (زینب) نے اپنی پر جوش انگریزی تقریر میں عورتوں کے ساتھ امتیازی سلوک پر سخت احتجاج کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے عورتوں کو گھر میں رکھنے کا ذکر کیا۔ اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی کہا کہ عورتوں کا ختنہ کیا جاتا ہے جو عورتوں کے اوپر سراسر ظلم ہے۔ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ گھر کا معاملہ عورتوں کے سپرد کرنا ایک صحیح اسلامی تعلیم ہے اور اس کی حکمت تقسیم کار ہے۔ جب کہ عورتوں کا ختنہ سراسر ایک جاہلانہ رواج ہے جو افریقہ کے بعض قبائل میں پایا جاتا ہے، مگر اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

اسی طرح ایک صاحب ساؤتھ افریقہ سے آئے تھے۔ انھوں نے حج کے "مراسم" پر تبصرہ کرنا شروع کیا۔ انھوں نے حج کے واقعی اور ثابت شدہ مراسم پر اظہار خیال کرتے ہوئے اسی میں یہ بات بھی شامل کر دی کہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ حجر اسود پہلے سفید تھا۔ مگر وہ انسانوں کے گناہ سے کالا ہو گیا۔ مگر یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ حج کے ثابت شدہ مراسم فی الواقع حج کے اجزاء ہیں۔ جب کہ حجر اسود کا سفید سے کالا ہو جانا ایک بے بنیاد کہانی ہے جس کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔

میں ۱۹۵۷ سے ۱۹۶۳ تک جماعت اسلامی ہند کی مرکزی مجلس شوریٰ کا رکن تھا۔ اس وقت سے لے کر اب تک مجھے بہت سی جماعتوں اور تنظیموں کے اجلاس میں شرکت کا اتفاق ہوا ہے۔ میں نے مشترک طور پر ہر جگہ یہ بات پائی ہے کہ لوگ الفاظ پر اس قدر بحث کرتے ہیں جیسے کہ ان کے یہی الفاظ تاریخ بننے والے ہیں۔ جو لفظ وہ اجتماع گاہ میں کاغذ پر لکھ دیں گے وہی باہر کی دنیا میں پہونچ کر واقعہ بن جائیں گے۔

مثلاً اس موتمر کے آخری اجلاس میں ایک تجویز پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک شخص نے تجویز پیش کی کہ ایران۔عراق جنگ کے بارہ میں ایک تجویز پاس ہو اور اس کو دونوں ملکوں کے ذمہ داروں

کے نام روانہ کیا جائے۔ تجویز یہ تھی کہ دونوں ممالک شہروں میں جنگ کو بند کر دیں۔ اس تجویز میں ابتدائً ایقاف الحرب فی المدن (شہروں میں جنگ نہ کرنے) کا لفظ تھا۔ دوسرے شخص نے پرجوش طور پر کہنا شروع کیا کہ نہیں، بلکہ ضرورت ہے کہ یہ جنگ مکمل طور پر بند ہو، اس لیے تجویز میں ایقاف الحرب نہائیاً کا لفظ لکھا جائے۔ اب اس پر بحث چل پڑی کہ یہ لفظ لکھا جائے کہ وہ لفظ لکھا جائے۔ اور کافی دیر تک اس پر تکرار ہوتی رہی۔

یہ طے شدہ ہے کہ اس تجویز کے نتیجہ میں نہ شہروں کی جنگ رکنے والی ہے اور نہ یہ ہونے والا ہے کہ اس کے ایران اور عراق پہونچتے ہی جنگ کا مکمل خاتمہ ہو جائے۔ اس قسم کے واقعات حقائق کے زور پر ایک یا دوسری صورت میں فیصل ہوتے ہیں نہ کہ الفاظ کے زور پر۔

سوڈان کے ایک عالم اسٹیج پر آئے۔ ان کو ایک محاضرہ پر اپنی رائے کا اظہار کرنا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اس محاضرہ میں بہت سی غلطیاں کی گئی ہیں۔ میں ان کی تصحیح کرنا چاہتا ہوں۔ مگر پروگرام کے مطابق چوں کہ بہت کم وقت دیا گیا ہے، اس لیے میں محاضر کو اس کی صرف ایک غلطی کی طرف متوجہ کروں گا۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ محاضر نے اپنے لکچر میں قرآن کی آیت انی جاعل فی الارض خلیفۃ کا ذکر کیا ہے اور اس کی تشریح یہ کی ہے کہ قوم یخلف بعضھم بعضا۔ انھوں نے پرجوش طور پر کہا کہ خلیفہ کا یہ مفہوم عجیب مفہوم ہے۔ میں نے تفسیر کی جتنی کتابیں دیکھی ہیں ان میں سے کسی کتاب میں یہ معنی مذکور نہیں:

لم یرد ھذا المعنی فی ای کتاب من کتب التفسیر اطلعت علیہ

یہ اس بات کی ایک دلچسپ مثال ہے کہ اکثر لوگ اپنی بے خبری کو یقین کا قائم مقام بنا لیتے ہیں۔ حالاں کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ خلیفہ کا مذکورہ مفہوم واضح طور پر تفسیر کی کتابوں میں موجود ہے

ترکی کے نمائندہ استاد اوغلو نے عربی زبان کی اہمیت بتاتے ہوئے کہا کہ اسلامی کانفرنسوں میں میں نے دیکھا ہے کہ عربی زبان کے بعد جو دوسری زبانیں استعمال ہوتی ہیں وہ انگریزی اور فرانسیسی زبانیں ہیں۔ میری تجویز ہے کہ اس صورت حال کو بدلا جائے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ مسلم نسلوں کو ترکی اور اردو زبانیں پڑھائی جائیں جو کروروں مسلمانوں کی زبانیں ہیں۔ اس طرح ترکی اور اردو دھیرے دھیرے عربی کے بعد استعمال ہونے والی زبانیں بن جائیں گی۔

بظاہر یہ ایک بہت اچھی تجویز معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ صرف ایک تمنا ہے جو عملاً ممکن نہیں۔ اصل یہ ہے کہ مادری زبان کے بعد دوسری زبانیں جو آدمی سیکھتا ہے وہ ہمیشہ مادی عوامل کے تحت سیکھتا ہے۔ انگریزی یا فرانسیسی اسلامی کانفرنسوں کی سکنڈ لنگویج اس لیے بنی ہوئی ہے کہ لوگوں کے مادی مصالح انھیں مجبور کرتے ہیں کہ وہ ان زبانوں کو سیکھیں۔ جب تک کوئی ایسا انقلاب نہ آئے جو ترکی اور اردو جیسی زبانوں کو وہی مقام دیدے جو انگریزی زبان کو یا فرانسیسی زبان کو عالمی سطح پر حاصل ہے، اس وقت تک اس قسم کی کسی تجویز کا واقعہ بننا ممکن نہیں۔

مفتی شام (حلب) نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں اپنے پچاس سال کے تجربات (تجارب خمسین سنة) کی روشنی میں کہتا ہوں کہ موجودہ زمانہ میں اسلامی تحریکوں کی ناکامی کی اصل وجہ اسلامی داعیوں کا عنف (شدت) ہے۔ انھوں نے ہر ملک میں غیر ضروری طور پر مسلم حکمرانوں سے ٹکراؤ کیا۔ اس کے نتیجہ میں اسلامی داعیوں اور مسلم حکمرانوں کے درمیان لامتناہی جنگ چھڑ گئی۔ اگر اسلامی داعیوں نے مسلم حکمرانوں سے ٹکراؤ کی پالیسی اختیار نہ کی ہوتی تو آج اسلامی دعوت کی تاریخ دوسری تاریخ ہوتی۔ یہی بات جمہوریہ یوگنڈا کے نائب صدر الحاج موسیٰ تشکانگو نے دوسرے انداز سے کہی۔ انھوں نے کہا کہ اگر ہمیں اسلامی دعوت کو ترقی دینا ہے تو ہم کو کبھی بھی مذہب کے ساتھ سیاست کو نہیں ملانا چاہیے۔

دوسری مسلم کانفرنسوں کی طرح یہاں بھی میں نے کسی مقرر کی آواز میں درد کی جھلک نہیں پائی۔ اس میں میرے احساس کے مطابق صرف ایک استثنار تھا۔ اور وہ دکتور محمود ایوب (لبنان) کا تھا۔ وہ دونوں آنکھ سے محروم تھے اور سہارا دے کر اسٹیج پر لائے گیے تھے۔ اس نابینا مقرر کی آواز میں مجھے درد اور سوز محسوس ہوا مگر بینا مقررین میں سے کسی کی آواز میں میں نے درد اور سوز کی کیفیت نہیں پائی۔ یہ درد جو ایک شخص کے اندر حیاتیاتی صدمہ کے نتیجہ میں پیدا ہوا، کاش یہی درد امت کے رہنماؤں کے اندر امت پر گزرنے والے صدمہ کی بنا پر پیدا ہو جائے تو سارا نقشہ اپنے آپ بدل جائے۔

دکتور محمود ایوب (لبنان) نے عربی میں بولتے ہوئے ایک شخص کے سوال کا حوالہ

دیا جس نے انگریزی زبان میں اپنا سوال پیش کیا تھا، اور پھر اچانک وہ انگریزی میں بولنے لگے۔ موجودہ زمانہ میں بہت سے لوگ ہیں جو بیک وقت کئی کئی زبانوں میں بول سکتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو کیسا عجیب وغریب دماغ دیا ہے۔ جس طرح ریڈیو میں ایک بٹن دبا کر آپ ایک زبان کی نشریات سنتے ہیں اور دوسرا بٹن دبائیں تو دوسری زبان کی نشریات آنے لگیں گی، اور تیسرا بٹن دبائیں تو تیسری زبان کی۔ یہی حال زیادہ عجیب تر شکل میں انسانی دماغ کا ہے۔ کیسا عظیم ہوگا وہ خالق جس نے ایسے انسانی دماغ کو بنایا۔

یہ سوچتے ہوئے میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوگیے۔ میں نے کہا کہ خدایا، مجھے ان لوگوں میں لکھ لیجیے جنھوں نے آپ کی عظمت کا اعتراف کیا، اس وقت جب کہ انھوں نے اس کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا، اس وقت جب کہ وہ اس کا اعتراف کرنے پر مجبور نہیں ہوئے تھے۔

ہر آدمی چیزوں کو اپنے اپنے نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کی ایک دلچسپ مثال نائجیریا کی ایک مسلم خاتون (زینب) کی تقریر میں سامنے آئی۔ ان دنوں ٹیلی وزن پر عمر مختار کی مشہور فلم دکھائی گئی تھی۔ خاتون نے کہا کہ میں نے پچھلی رات کو ٹیلی وزن پر عمر مختار فلم دیکھی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ فلم نہایت شاندار ہے۔ مگر طویل فلم میں سارا کردار صرف مرد ادا کرتے ہیں۔ واحد موقع جب کہ اس فلم میں عورت کو دکھایا گیا ہے۔ وہ موقع وہ ہے جب کہ عمر مختار کی بیوی کو اطالویوں نے گھر سے نکال کر سولی پر چڑھا دیا۔

اس تاریخی فلم کا ایک حصہ راقم الحروف کے سامنے بھی گذرا تھا۔ خاتون کی بات بطور واقعہ درست ہے۔ تاہم میرے ذہن میں اس قسم کا خیال بھی نہیں آیا۔ مگر جب ایک آزادی پسند خاتون نے اس کو دیکھا تو اس کو پوری فلم میں سب سے زیادہ قابل لحاظ بات جو نظر آئی وہ یہ تھی کہ اس میں عورت کے کردار کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

فلم عمر مختار اور فلم گاندھی کا موضوع اس اعتبار سے مشترک ہے کہ دونوں ایک ایک ملک کی آزادی کی جدوجہد کی تصویر کشی کرتی ہیں۔ مگر اس کو دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ "گاندھی" کے مقابلہ میں "عمر مختار" زیادہ عظیم ہے۔ اس کی وجہ فن کا فرق نہیں ہے۔ بلکہ خود کہانی کا فرق ہے۔ "گاندھی" ایک ایسے لیڈر کی کہانی کو مصور کرتی ہے جس نے "امن" کی طاقت سے ہندستان

کو آزاد کرایا۔ اس کے مقابلہ میں "عمر مختار" نے اطالویوں کا مقابلہ مسلح انداز سے کیا۔ گاندھی فلم میں اگر "پرامن مارچ" کے مناظر ہیں تو عمر مختار فلم میں دہشت اور خونخواری کے مناظر۔ یہی وہ فرق ہے جس نے "گاندھی" کے مقابلہ میں "عمر مختار" کو دیکھنے والوں کے لیے زیادہ پرشوکت بنا دیا ہے۔

آدمی خواہ بزدل ہو مگر وہ جنگ اور جہاد کی باتوں کو پسند کرتا ہے۔ "عمر مختار" میں اگرچہ فنی کمال بھی اپنے انتہائی درجہ پر ہے، تاہم اس میں اگر عمر مختار کی ماں یا ان کی بیوی کا وہ کردار دکھایا جاتا جب کہ انھوں نے گھر کو سنبھالا اور بچوں کی پرورش کی، تو اس قسم کے مناظر باعتبار حقیقت عظیم ہونے کے باوجود دیکھنے والوں کو عظیم نظر نہ آتے۔ مگر موجودہ شکل میں وہ مار دھاڑ کی ایک فلم ہے، اور اسی چیز نے اس کو عظیم بنا دیا ہے۔ جنگی مشینوں کی گڑگڑاہٹ گولوں کے دھماکے، آگ اور خون کے ہولناک مناظر، میدان جنگ کا پرہول نقشہ، فتح وشکست کے جذباتی لمحات اس قسم کی چیزیں اس میں کمال درجہ میں موجود ہیں۔ اور یہی اس کی کامیابی کا اصل راز ہے۔

ایک عرب نوجوان جو برلن (جرمنی) سے آئے تھے، انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہم بحیثیت مسلمان امن کو پسند کرتے ہیں۔ مگر ہم کسی کے آگے جھکنے کے لیے تیار نہیں:

انناکمسلمین نحب السلام ولکننا نرفض الاستسلام

بظاہر یہ ایک بڑی اچھی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ صرف ایک پرجوش کلمہ ہے، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پرامن وہی شخص رہ سکتا ہے جو اپنے آپ کو ردعمل کی نفسیات سے بچائے۔ اس دنیا میں امن پسندی نام ہے بے امنی کے باوجود پرامن رہنے کا۔ مگر مذکورہ قسم کے پرجوش مقررین اس راز سے واقف نہیں۔

کانفرنس میں مختلف لوگوں نے اپنے اپنے ملک میں اسلام اور مسلمانوں کی حالت کے بارے میں کتابچے اور رپورٹیں تقسیم کیں۔ ان میں کافی معلومات اور تجربات درج تھے جن کی تفصیل سفرنامہ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

سرینام کے وفد نے تین صفحہ کی ایک رپورٹ تقسیم کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت

سرینام کی مجموعی آبادی میں بیس فی صد مسلمان ہیں۔ اور پورے ملک میں ایک سو سے زیادہ باقاعدہ مسجدیں موجود ہیں۔ رپورٹ کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے :

The immigration of Muslims in Surinam occurred in the 17th century when the African slaves were brought by the European slave traders to work in the fields. Many of these Africans were Muslims and when they arrived, they tried the utmost to keep their faith alive.

سرینام میں مسلمانوں کی مہاجرت ۱۷ ویں صدی عیسوی میں ہوئی۔ جب کہ یورپ کے بردہ فروش افریقی غلاموں کو لے آئے تاکہ وہ یہاں کے کھیتوں میں کام کر سکیں۔ ان افریقیوں میں اکثر مسلمان تھے اور جب وہ یہاں آئے تو انھوں نے پوری کوشش کی کہ وہ اپنی دینی حیثیت کو باقی رکھ سکیں۔

یہ واقعہ جس کا ذکر یہاں سُرینام کے ذیل میں کیا گیا ہے، یہی موجودہ زمانہ میں تمام دنیا میں پیش آیا۔ موجودہ زمانہ میں جب مغربی قومیں ابھریں اور انھوں نے تمام دنیا کو زیر کر لیا تو وہ اپنے مقبوضہ ملکوں (ہندستان، افریقہ وغیرہ) سے لاکھوں انسانوں کو لے گیے تاکہ انھیں اپنے زیر قبضہ علاقوں میں بطور مزدور استعمال کر سکیں۔ اس طرح مسلمان اچانک ساری دنیا میں پھیل گیے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ساری دنیا میں آسٹریلیا سے لے کر باربیڈوز تک ہر جگہ مسلمانوں کی آبادیاں پائی جاتی ہیں۔

یہی واقعہ اس سے پہلے تاتاریوں کے زمانہ میں پیش آیا تھا۔ تاتاریوں نے فتح کے بعد کثیر تعداد میں مسلمان عورتوں اور مسلمان مردوں کو غلام بنایا۔ تاہم اس وقت لوگوں کے اندر اسلام زندہ تھا۔ یہ مسلمان مرد اور عورت جہاں پہونچے وہاں انھوں نے تاتاریوں کے درمیان خاموش تبلیغ شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف دو نسل کے اندر بیشتر تاتاری مسلمان ہو کر اسلام کے پاسبان بن گیے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں اگر دعوتی ذہن ہوتا تو وہی واقعہ دوبارہ نئی شکل میں پیش آتا جو تاتاریوں کے زمانے میں پیش آیا۔ جن مغربی قوموں کو اسلام دشمن قرار دے کر ہم ان کے خلاف بے معنی احتجاج میں مشغول ہیں، وہ قومیں آج اسلام کے دائرہ میں داخل ہو کر اسلام کی پاسبان بن چکی ہوتیں۔

۱۸ ستمبر کی شام کو ایک ہندستانی مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ وہ لندن سے روانہ ہو کر یہاں پہونچے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ دہلی میں دوبارہ فساد ہو گیا ہے۔ اور اس فساد کا رخ مسلمانوں کی طرف ہے۔ اگرچہ بعد کی تحقیق نے بتایا کہ یہ خبر صحیح نہ تھی۔

ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات میں مسلمانوں کا سارا غصہ ہمیشہ "فسادیوں" کے خلاف ہوتا ہے۔ مگر ذاتی طور پر میں ان فسادات کا ذمہ دار مسلمانوں کو سمجھتا ہوں۔ اس لیے میرے تمام احساسات کا رُخ صرف مسلمانوں کی طرف رہتا ہے۔ مجھے مسلمانوں کی حالت پر افسوس ہوتا ہے کہ وہ حقائق کی دنیا میں حقائق سے بالکل بے پروا ہو کر زندہ رہنا چاہتے ہیں۔

ان فسادات کی جڑ میرے نزدیک یہ ہے کہ مسلمانوں نے ملک کو تقسیم کرا لیا، مگر وہ تقسیم کے نتائج قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ملک کو "ہندو انڈیا" اور "مسلم انڈیا" میں تقسیم کرنے کا لازمی مطلب یہ تھا کہ مسلمان "ہندو انڈیا" میں اپنے لیے نمبر ۲ کی حیثیت قبول کرنے پر راضی ہیں۔ اگر مسلمانوں نے خود اپنے عمل کے اس نتیجہ کو ۱۹۴۷ کے بعد قبول کر لیا ہوتا تو حالات معمول پر آجاتے اور ملک کی تاریخ فرقہ وارانہ فساد کے بجائے فرقہ وارانہ تعمیر کی تاریخ ہوتی (واضح ہو کہ نمبر ۲ کی حیثیت کا مطلب مسلمانوں کا درجہ گرانا نہیں، بلکہ صرف حقیقتِ واقعہ کا اعتراف کرنا ہے)۔

مگر ملک کی جدید تاریخ کا یہ عجیب حادثہ ہے کہ پاکستان کے ایک کروڑ سے زیادہ ہندؤوں نے پاکستان میں اپنے لیے عین اسی حیثیت کو قبول کر لیا جو نئے حالات کا تقاضا تھا، حالاں کہ انھوں نے تقسیم کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔ مگر ہندستان کے مسلمان ہندستان میں اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے، اگرچہ یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے یک طرفہ طور پر تقسیم کی تحریک چلائی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندستانی مسلمان تقسیم سے پہلے جن خود ساختہ مسائل سے دوچار تھے، تقسیم کے بعد بھی وہ انھیں خود ساختہ مسائل میں مبتلا ہیں۔ حقیقت واقعہ کا اعتراف اس دنیا میں آدمی کے لیے زندگی کے دروازے کھولتا ہے۔ ہندستانی مسلمان حقیقت واقعہ کے اعتراف کے لیے تیار نہیں، اس لیے زندگی کے دروازے بھی اب تک ان کے لیے نہیں کھلے۔

مسلمانوں نے اس ملک میں چالیس قیمتی سال کھو دیے ہیں۔ اگر وہ اپنے مزاج کو نہ بدلیں تو وہ اگلے چالیس سال بھی کھو دیں گے۔ موجودہ مزاج کے ساتھ مسلمانوں کے لیے اپنے مستقبل کی

کامیاب تعمیر ممکن نہیں۔

بنگلہ دیش کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا: مسلم ممالک کا المیہ یہ ہے کہ اس وقت کسی بھی مسلم ملک میں کوئی طاقت ور قائد (ان کے الفاظ میں اسٹرانگ لیڈر) نہیں۔ میں نے کہا کہ بنگلہ دیش کو تو شیخ مجیب الرحمٰن کی شکل میں ایک طاقت ور قائد حاصل تھا۔ پھر اس طاقتور قائد نے اپنے ملک کو کیا دیا۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ وہ طاقت ور قائد تھے مگر انھوں نے ملک کو برباد کیا۔ میں نے کہا کہ اس سے معلوم ہوا کہ قومی تعمیر کے لیے صرف "طاقت ور قائد" کافی نہیں۔ پھر میں نے کہا کہ آج اصل کمی قائدِ قوی کی نہیں، اصل کمی قائدِ حکیم کی ہے۔ آج ہر مسلم ملک میں ایسے افراد موجود ہیں جن کے پاس طاقت ہے، جن کے پاس وسائل ہیں۔ مگر وہ چیز اُن کے پاس نہیں جس کو دانش کہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں دانش کی کمی نے مسلم ملکوں کو برباد کیا ہے نہ کہ طاقت کی کمی نے۔

ایک بار کھانے کے وقت میری میز کے قریب چند باریش بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی اردو زبان اور موضوعِ گفت گو سے معلوم ہوا کہ وہ پاکستان سے آئے ہیں اور "دیوبندی مکتبِ فکر" سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک بزرگ نے پرجوش طور پر کہا کہ "ہندستان میں صرف ۱۷ دن کے اندر پچپن ہزار علماء شہید کر دیے گیے" میں نے پوچھا کہ حضرت، اسلام میں شہادت برائے شہادت ہے کہ شہادت کا کوئی مقصد ہے۔ انھوں نے کہا کہ شہادت کا مقصد بالکل واضح ہے۔ میں نے کہا کہ وہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا: اعلاء کلمۃ اللہ۔ میں نے کہا کہ دورِ اول میں ۵۵ سو سے بھی کم آدمیوں نے شہادت پائی اور اللہ کا کلمہ بلند ہو گیا۔ موجودہ زمانہ میں ۵۵ ہزار بزرگ شہید ہو گیے اور اب تک اللہ کا کلمہ بلند نہ ہو سکا۔ اس پر وہ بگڑ گیے۔ میں نے آگے کلام کو جاری رکھنا مناسب نہ سمجھا اور وہاں سے اٹھ گیا۔

پاکستان کی پوری آبادی ساڑھے نو کرور ہے۔ ان میں مہاجرین کی تعداد تقریباً ڈیڑھ کرور ہے۔ غیر مسلم ایک کرور اور کچھ لاکھ ہیں۔ کراچی شہر کی آبادی ۷۰ لاکھ ہے۔ اس میں مہاجرین کی تعداد تقریباً ۴۰ لاکھ ہے۔

ایک صاحب روانڈا (وسط افریقہ) سے آئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ روانڈا میں مسلمان

تقریباً ۲ فی صد ہیں۔ اسلام وہاں تیزی سے پھیل رہا ہے۔ ہر روز کچھ نہ کچھ لوگ اسلام قبول کرتے ہیں۔ وہاں کی حکومت سیکولر ہے اور وہ مذہبی تبلیغ کی مکمل آزادی دیے ہوئے ہے۔ البتہ اکثر افریقی ملکوں کی طرح وہاں بھی یہ مسئلہ ہے کہ مسلمانوں کا کوئی سماجی کام نہیں۔ وہاں کی مسیحی تنظیموں نے کثیر تعداد میں اسکول کالج اور اسپتال کھول رکھے ہیں۔ حتی کہ وہ نہریں نکالنے اور زراعت کو ترقی دینے میں عوام کی مدد کرتے ہیں۔ دوسری طرف مسلمان سماجی خدمات کے ان میدانوں میں بالکل صفر کے درجہ میں ہیں۔ مسلمانوں کی اس کمی کی وجہ سے ان کو عزت کا مرتبہ حاصل نہیں۔ ایک آدمی اگر کوئی کام نہ کرے تو وہ حقیر سمجھ لیا جاتا ہے:

الواحد اذا لم یعمل یحتقر

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو برطانیہ سے آئے تھے۔ وہ اصلاً ہندستانی ہیں اور برطانیہ میں ۲۰ سال سے کسی مسجد کے امام ہیں۔ انھوں نے کہا کہ برطانیہ کے مسلمان پہلے نہایت سکون کے ساتھ رہ رہے تھے۔ مگر جب سے وہاں علماء کرام پہونچے ہیں، مسلمانوں کے آپس کے دینی جھگڑے بہت بڑھ گیے ہیں۔ مسلمان گروہوں گروہوں میں بٹ گیے ہیں اور ہر گروہ دوسرے گروہ کی کاٹ میں لگا رہتا ہے اور یہ سب ہمارے علماء کرام کی دین ہے۔

انھوں نے اپنا قصہ بتایا کہ میری مسجد کے نمازیوں میں سے ایک پاکستانی نے میرے خلاف یہ پروپیگنڈا شروع کیا کہ میں ہندستان کا ایجنٹ ہوں۔ وہ صاحب مسجد کمیٹی کے ممبر تھے۔ ایک بار انھوں نے کمیٹی کے اجلاس کا اعلان کر دیا۔ ان کا ارادہ تھا کہ اس اجلاس میں میرے خلاف تجویز پاس کر کے مجھے مسجد کی امامت سے علیحدہ کر دیا جائے۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے کمیٹی کے اجلاس کی براہ راست مخالفت نہیں کی۔ بس خاموشی کے ساتھ یہ کیا کہ کوشش کر کے اجلاس کی تاریخ آگے بڑھوا دی تاکہ مجھ کو اجلاس سے پہلے ایک جمعہ مل جائے۔

کمیٹی کے ممبران میں پاکستانی افراد کی اکثریت تھی۔ جب کہ نمازیوں میں تقریباً ۵۰ فی صد ہندستانی تھے اور ۵۰ فی صد پاکستانی۔ جمعہ کے دن تمام لوگ جمع ہوئے تو میں نے مفصل تقریر کی اور اس تقریر میں ہندستانی مسلمانوں کی وہ قربانیاں بتائیں جو انھوں نے پاکستان کے قیام کے لیے کی ہیں اور آج بھی وہ اس کی قیمت دیئے چلے جارہے ہیں۔ ان باتوں کا زبردست اثر ہوا اور

پوری فضا مذکورہ پاکستانی کے خلاف ہوگئی۔ نہ صرف یہ کہ میرے خلاف تجویز ختم ہوگئی بلکہ مذکورہ پاکستانی ممبر کو کمیٹی سے علٰحدہ کر دیا گیا۔

یہی حکمت مسائل کو حل کرنے کا واحد یقینی طریقہ ہے۔ مسئلہ خواہ مسلمان اور مسلمان کے درمیان ہو یا مسلمان اور غیر مسلمان کے درمیان، وہ حکمت ہی کے ذریعہ حل ہو سکتا ہے۔ غیر حکیمانہ طریقہ صرف مسئلہ کی شدت کو بڑھاتا ہے، وہ کسی بھی درجہ میں اس کو کم نہیں کرتا۔ مگر بدقسمتی یہ ہے کہ زندگی کے اس راز کو لوگ صرف اپنے ذاتی معاملہ میں یاد رکھتے ہیں، وہ قومی معاملہ میں ہمیشہ اس کو بھول جاتے ہیں۔

جنوبی افریقہ کے ایک ڈاکٹر سے ملاقات ہوئی۔ وہ جنوبی افریقہ کے شہری ہیں۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ جنوبی افریقہ کے بارہ میں اکثر ظلم و فساد کی خبریں دوسرے ملکوں کے اخباروں میں چھپتی رہتی ہیں۔ ان کو ہمارے وہ رشتہ دار پڑھتے ہیں جو یورپ اور امریکہ وغیرہ میں ہیں۔ وہ ہم کو لکھتے ہیں کہ جنوبی افریقہ کے حالات اتنے خراب ہیں، وہاں جان و مال محفوظ نہیں، پھر آپ وہاں کیوں پڑے ہوئے ہیں۔ آپ جنوبی افریقہ کو چھوڑ کر ہمارے یہاں آجائیے۔ ہم ان کو جواب دیتے ہیں کہ جو کچھ اخباروں میں چھپتا ہے وہ اخباروں کی اپنی ایجاد ہے، ورنہ جنوبی افریقہ کے حالات ایسے نہیں۔ معمولی کھٹ پٹ ضرور ہوتی ہے تو معمولی کھٹ پٹ کہاں نہیں۔ انھوں نے کہا کہ ظلم کے واقعات زیادہ تر ان لوگوں کے ساتھ ہوتے ہیں جو حکمرانوں کے خلاف متشددانہ تحریک چلاتے ہیں، عام باشندوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

میں نے کہا کہ ٹھیک یہی ہندستان کا معاملہ بھی ہے۔ ہندستان بہت بڑا ملک ہے۔ اس کی آبادی بہت زیادہ ہے۔ کہیں کوئی جھڑپ یا کھٹ پٹ ہوگئی تو باہر کے اخبار میں چھپتا ہے ــــــ "ہندستان میں فساد"۔ حالاں کہ جو واقعہ ہوتا ہے وہ بھی ہندستان کی لاکھوں بستیوں میں سے ایک بستی میں اور اکثر بستی کے ایک محلہ میں ہوتا ہے۔ اور اخبار والے اس کا عنوان بنا دیتے ہیں "ہندستان میں فساد"۔ اس کی وجہ سے لوگ غیر ضروری طور پر تشویش میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

واقعات کے مطالعہ کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ایک واقعہ کو اسی نوعیت کے دوسرے واقعات سے ملا کر دیکھا جائے۔ جو لوگ ہندستان میں مسلمانوں پر غیر مسلموں کے مظالم کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں

انھیں مسلم ملکوں میں مسلمانوں پر مسلمانوں کے مظالم کو بھی سامنے رکھنا چاہیے۔ افریقہ کی کانفرنس میں سوڈان کے ایک اسلام پسند بزرگ نے جعفر نمیری کے مظالم بیان کیے اور اس کے لیے "شیطان" کا لفظ استعمال کیا۔ حالاں کہ وہاں ظالم اور مظلوم دونوں مسلمان ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا مقابلہ اور مسابقت کی دنیا ہے۔ یہاں ہر ایک دوسرے کو پیچھے دھکیل کر آگے بڑھ جانا چاہتا ہے۔ اس لیے یہاں شکایت اور احتجاج سے کوئی فائدہ نہیں۔ کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ آدمی صورت حال کو سمجھے اور اس کے مطابق اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرے۔

۲۱ ستمبر کی شام کو عربوں کی ایک مجلس کو خطاب کرنے کا موقع ملا۔ یہ شام کے تمام عرب نوجوان تھے۔ میرے سوا وہاں کوئی ایک بھی اردو جاننے والا نہ تھا۔ اس لیے پوری تقریر عربی میں ہوئی اور تقریباً دو گھنٹے تک جاری رہی۔ ان لوگوں نے میری اس عربی تقریر کو دو کیسٹ پر ریکارڈ کیا۔

اس تقریر میں میں نے تفصیل کے ساتھ بتایا کہ ایمان ایک اکتشاف ہے۔ اسی اکتشاف سے وہ چیز ابھرتی ہے جس کو دعوت کہا جاتا ہے۔ عام مسلمانوں کے لیے تقلیدی ایمان بھی کافی ہو سکتا ہے مگر داعی وہی شخص بن سکتا ہے جس کو اکتشاف کے درجہ میں ایمان حاصل ہوا ہو۔

پھر میں نے موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکوں کا ذکر کیا جو اسلامی انقلاب کے نام پر اٹھیں میں نے مثالیں دے کر بتایا کہ یہ تمام تحریکیں رد عمل کی نفسیات کے تحت پیدا ہوئیں۔ ان تحریکوں کے قائدین نے دیکھا کہ غیر مسلم اقوام نے ان سے ان کی عظمت چھین لی ہے۔ اس احساس نے انھیں بھڑکایا اور وہ ان سے لڑنے کے لیے کھڑے ہو گیے۔ حقیقی داعی وہ ہے جو احساس یافت پر اٹھے۔ مگر یہ لوگ احساس زیاں پر اٹھے۔ اس دنیا میں "زیاں" کو بھولنا پڑتا ہے، اس کے بعد ہی آدمی کو "یافت" کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ مگر ہمارے رہنما اس حوصلہ مندی کا ثبوت نہ دے سکے۔ اس لیے وہ احساس محرومی سے اوپر اٹھنے میں کامیاب بھی نہیں ہوئے۔

میری تقریر کا آخری خلاصہ یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عظیم انقلاب برپا کیا جس کی کوئی دوسری مثال انسانی تاریخ میں نہیں۔ جب کہ موجودہ زمانہ کے مسلم مفکرین بے شمار قربانیوں کے باوجود کوئی انقلاب برپا نہ کر سکے۔ اس کا سبب در اصل وہ فرق ہے جو رسول اللہ اور ان مسلم مفکرین کے درمیان پایا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احساس یافت پر کھڑے ہوئے تھے۔ اس کے

برعکس موجودہ زمانہ کے مسلم مفکرین احساس محرومی پر کھڑے ہوئے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایمان ایک عظیم دریافت کے ہم معنی تھا۔ وہ ہر چیز سے زیادہ عظیم تھا۔ گویا کہ آپ لوگوں سے کہہ رہے تھے: اے لوگو، میرے پاس ایک بہت بڑی چیز ہے۔ میرے پاس آؤ تاکہ میں تم کو وہ چیز دوں۔ اس کے برعکس موجودہ مسلم مفکرین کا معاملہ یہ ہے کہ ان کے پاس کوئی بڑی چیز نہیں۔ گویا کہ وہ لوگوں سے کہہ رہے ہیں: اے لوگو، تم نے ہم سے تمام چیزیں چھین لی ہیں۔ تو تم چھینی ہوئی چیزوں کو ہمیں واپس کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت دینے والے کی تھی اور ہمارے رہنماؤں کی حیثیت مانگنے والوں کی۔ اس فرق کے بعد کیسے ممکن تھا کہ ان کے ذریعہ سے وہ چیز ظہور میں آئے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ظہور میں آئی:

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم حقق ثورۃ عظیمۃ، لا نظیر لها فی التاریخ الانسانی والمفکرون المسلمون المعاصرون عجزوا عن تحقیق ای ثورۃ ولو بعد بذلهم تضحیات عظیمۃ۔ والسبب یرجع الی فرق جوهری بین عمل النبی صلی اللہ علیہ وسلم وعمل هؤلاء المفکرین۔ فالنبی قام عمله علی احساس الوجدان، وهم قد قام عملهم علی احساس الخسارۃ والفقدان۔ ان ایمان الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کان له کالکشاف عظیم، یفوق کل شیئ۔ فکانه کان فی دعوته یقول: ایها الناس، عندی شیئ عظیم۔ تعالوا الیّ فنا عطیکم منه۔ وهؤلاء المفکرون لیس عندهم ای شیئ۔ وکانهم یقولون۔ ایها الناس، انکم سلبتم منا کل شیئ فردّوا علینا الاشیاء التی سلبتموها منا۔ فالرسول صلی اللہ علیہ وسلم کان کالواهب او کالعاطی وهم کالسائلین۔ فکیف یتأتی لهم ان یحققوا ما حققه الرسول صلی اللہ علیہ وسلم۔

واپسی میں عجیب قصہ پیش آیا۔ کراچی سے ۲۲ ستمبر کی شام کو دہلی کے لیے روانگی ہوئی۔ کراچی سے دہلی کا سفر ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہوتا ہے۔ جہاز معمول کے مطابق ۱۰ ہزار میٹر کی بلندی پر اڑ رہا تھا۔ یہاں تک کہ "کرسی کی پیٹی باندھ لیں" کی علامت روشن ہوئی۔ بظاہر اس کا مطلب یہ تھا کہ اب دہلی قریب آگیا ہے۔ مگر کچھ دیر کے بعد روشنیاں بجھ گئیں۔ اور جہاز بدستور اڑتا رہا، یہاں تک کہ پرواز کی حالت میں دو گھنٹے سے زیادہ گزر گیے۔ ہم اسی تشویش میں مبتلا تھے کہ جہاز کے

ذمہ داروں کی طرف سے اعلان ہوا کہ خراب موسم کی وجہ سے ہم دہلی کے ایرپورٹ پر نہ اتر سکیں گے، اور اب ہم دوبارہ کراچی واپس جا رہے ہیں۔

تقریباً تین گھنٹہ فضا میں رہنے کے بعد جہاز دوبارہ کراچی کے ایرپورٹ پر اتر گیا۔ تمام مسافر لاونج میں بیٹھا دیے گیے۔ کئی گھنٹے تک انتظار کی غیر یقینی حالت طاری رہی۔ اس کے بعد اعلان ہوا کہ جہاز دوبارہ دہلی کے لیے روانہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ تمام مسافر دوبارہ جہاز پر سوار ہوئے۔ مقررہ وقت کے مطابق ہم ۵ بجے شام کو دہلی پہونچ جاتے۔ مگر اس افتاد کی وجہ سے ہم رات کو ۱۲ بجے دہلی پہونچے ـــــــ جن ہوائی "حادثات" کا ذکر اس سے پہلے اخباروں میں پڑھا تھا وہ اس سفر میں کم از کم جزئی طور پر میرے ساتھ بھی پیش آ گیا۔

۲۴ ستمبر کو پی آئی اے کا جہاز جب درمیان سے واپس ہوا تو اس کو دوبارہ کراچی ایرپورٹ پر اترتے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ کیوں کہ وہ خود اپنے ملک میں اپنے ایرپورٹ پر اتر رہا تھا۔ مگر اس سے پہلے ۱۴ ستمبر کو جب ہمارے جہاز کا ایک انجن فیل ہو گیا تھا اور پائلٹ مجبور ہو گیا تھا کہ وہ اس کو زمین پر اتارے تو اس نے فضا سے وائرلیس کے ذریعہ قریب کے کئی ہوائی اڈوں سے رابطہ قائم کیا۔ مگر ہر ہوائی اڈہ اس کو اترنے کی اجازت دینے سے انکار کرتا رہا۔

آخر میں اس نے عمان ایرپورٹ سے بات کی۔ اس نے بھی ابتداءً انکار کیا۔ تقریباً آدھ گھنٹہ تک پائلٹ اور عمان ایرپورٹ کے ذمہ داروں کے درمیان بات چیت ہوتی رہی۔ پائلٹ نے اصرار کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت جہاز پر ۲۰۰ مسافر ہیں۔ آخر میں کیسے ایسا کروں گا کہ ان کو بے یار و مددگار چھوڑ دوں کہ وہ کسی کھڈ میں جا کر گر جائیں۔ اس گفتگو کے درمیان آدھ گھنٹہ تک جہاز عمان کے چاروں طرف اڑتا رہا۔ آخر کافی کہنے سننے کے بعد عمان ایرپورٹ نے اجازت دی۔ جب ہمارا جہاز ڈگمگاتے ہوئے عمان ایرپورٹ پر اترا تو وہاں مسلح پولیس پورے ایرپورٹ کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھی۔

اس غیر معمولی سلوک کی وجہ فضائی قزاقی ہے۔ ایسی صورت حال میں ایرپورٹ والے پہلا شبہ یہ کرتے ہیں کہ فضائی قزاقوں نے جہاز کو اپنے قبضہ میں لے لیا ہے اور اس کو کسی

غیر متعلق ایرپورٹ پر اترنے کے لیے مجبور کر رہے ہیں۔ جب فضائی قذافیوں کو ایسا کرنا ہوتا ہے تو وہ جہاز کے پائلٹ کو ہدایت کر دیتے ہیں کہ تم ہمارا نام ہرگز نہ لو، بلکہ یہ کہو کہ انجن کی خرابی یا کسی ٹکنکل سبب سے ہم جہاز کو اتارنے پر مجبور ہو گیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایرپورٹ نے ہمارے پائلٹ کے بیان پر یقین نہیں کیا اور اس کو اترنے کی اجازت دینے میں دیر لگائی۔

یہاں بظاہر مجھ کو ہر طرح کا آرام حاصل تھا، مادی اعتبار سے کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ مگر میری روح ہر وقت تڑپتی رہتی تھی۔ اصل یہ ہے کہ دہلی میں اپنے روزمرہ کے کام کے ساتھ میں اتنا زیادہ وابستہ ہو گیا ہوں کہ اس سے باہر نکلتے ہی میرا سکون بالکل چھن جاتا ہے۔ میرا حال اس مچھلی کا سا ہو جاتا ہے جس کو پانی سے نکال کر خشکی میں ڈال دیا گیا ہو۔ چنانچہ بارہ دن کے اس سفر میں شاید ایک لمحہ بھی ایسا نہ تھا جب کہ میں نے اپنے اندر سکون و اطمینان محسوس کیا ہو۔ اس پوری مدت میں مسلسل میں شدید کرب میں مبتلا رہا۔ یہ کرب صرف اس وقت ختم ہوا جب کہ میں ۲۴ ستمبر ۱۹۸۶ کو اپنے دہلی کے ماحول میں دوبارہ واپس آگیا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کے لیے سب سے بڑی چیز نفسیاتی سکون ہے نہ کہ مادی راحت۔ اگر آدمی نفسیاتی بےچینی میں مبتلا ہو تو مادی راحت کے سامانوں کے انبار کے درمیان بھی وہ اس طرح تڑپے گا جیسے وہ آگ کے انگاروں کے اوپر ڈال دیا گیا ہے ــــــ نفسیاتی بے آرامی ہر مادی آرام کو بے معنی بنا دیتی ہے۔

تعمیرِ ملّت

مکان بنانے کا کام بنیاد سے شروع ہوتا ہے

اور

قوم بنانے کا کام شعور بنانے سے۔

ماہنامہ الرسالہ قوم کی تعمیر کا یہی بنیادی کام کر رہا ہے۔

وہ افرادِ قوم کا شعور بنانے میں مصروف ہے۔

اس مہم میں ساتھ دینا ایک تاریخ ساز مہم میں ساتھ دینا ہے۔

الرسالہ کو پڑھیے

الرسالہ کو پڑھائیے

اس وقت یہی سب سے بڑا کام ہے جس میں آپ کو لگنا چاہیے۔

یہی آج کی سب سے بڑی مہم ہے جس میں آپ کو ساتھ دینا چاہیے۔

قوم کی تعمیر میں اپنا حصہ ادا کیجئے

دین سے دور

حدیثوں اور آیتوں سے واضح طور پر ثابت ہے کہ مسلمانوں کے لیے نجات اور کامیابی کا واحد راستہ یہ ہے کہ وہ رسول اور اصحاب رسول کے طریقہ پر چلیں۔ رسول نے اپنے عمل سے جو سنت چھوڑی ہے اور آپ کے اصحاب نے جس طرح اس کو اپنی زندگیوں میں اختیار کیا ہے وہی تمام مسلمانوں کے لیے واحد نمونہ ہے جس کو انھیں اختیار کرنا ہے۔ اس طریقہ میں خود سے کوئی اضافہ کرنا سراسر بدعت ہے۔ اور بدعت اللہ کے نزدیک جرم ہے۔

سنت کے طریقہ کو چھوڑنے کی بہت سی صورتیں ہیں۔ ان میں سے ایک صورت یہ ہے کہ سنت کے کچھ جزئی اور بے ضرر پہلوؤں کو لے لیا جائے اور سنت کے زیادہ اہم پہلوؤں کو چھوڑ دیا جائے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ اس لیے ایسا کرتے ہیں کہ جزئی اور ظاہری پہلوؤں کو اختیار کرنے سے ان کی زندگی پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ جب کہ سنت کے اہم پہلو آدمی سے اس کی زندگی میں تبدیلی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ وہ اس کی زندگی کے اس پورے ڈھانچہ کو بدل دینا چاہتے ہیں جو اس نے اپنی خواہشات اور مفادات کے تحت قائم کر رکھا ہے۔

یہی صورت حال بہت بڑے پیمانہ پر یہودیوں میں پیدا ہو گئی تھی۔ جس کی اصلاح کے لیے حضرت مسیح علیہ السلام ان کی طرف بھیجے گئے۔ حضرت مسیح نے اپنی ایک تقریر (متی ۲۳: ۲۳ — ۲۸) میں ان کو ان سخت الفاظ میں تنبیہ فرمائی:

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو، تم پر افسوس کہ پودینہ اور سونف اور زیرہ پر تو دہ یکی دیتے ہو۔ پر تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف اور رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے لازم تھا کہ یہ بھی کرتے اور وہ بھی نہ چھوڑتے۔ اے اندھے راہ بتانے والو، جو مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو۔ اے ریاکار فقیہو اور فریسیو، تم پر افسوس کہ پیالے اور رکابی کو اوپر سے صاف کرتے ہو مگر وہ اندر لوٹ اور ناپرہیزگاری سے بھرے ہوئے ہیں۔ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہیں۔

۱۔ ۷ مارچ ۱۹۸۷ کو گول مارکیٹ (نئی دہلی) میں ایک اجتماع ہوا۔ اس میں علاقہ کے تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز نے اس موقع پر قرآن وحدیث کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کا تعارف کرایا۔ یہ تقریر ٹیپ پر ریکارڈ کرلی گئی ہے۔

۲۔ ۱۲ مارچ ۱۹۸۷ کو صدر اسلامی مرکز نے نئی دہلی کے ایک اجتماع سے مختصر خطاب کیا۔ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا ملاجلا اجتماع تھا۔ خطاب کا موضوع یہ تھا کہ قرآن کو کس طرح سمجھا جائے۔ اور اس کی صحیح تفسیر تک کس طرح پہونچا جائے۔

۳۔ ۱۵ مارچ ۱۹۸۷ کو اسلامک اویکننگ سنٹر (اوکھلا، نئی دہلی) میں صدر اسلامی مرکز نے طلبہ اور اساتذہ کے ایک اجتماع سے خطاب کیا۔ اس خطاب میں بتایا گیا کہ علم کی اہمیت اسلام میں کتنی زیادہ ہے۔ اس سلسلہ میں سیرت کے بعض واقعات کی تشریح کی گئی۔

۴۔ ۲۱۔ ۲۲ مارچ ۱۹۸۷ کو مراد آباد میں حلقۃ الرسالہ کی طرف سے اجتماع ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کے پروگراموں میں شرکت کی۔ ملاقاتوں کے علاوہ دو پروگرام میں وہاں ان کی تقریر ہوئی۔ تقریر کا موضوع یہ تھا کہ موجودہ حالات میں اسلام کا احیاء کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ اس سفر کے بعد مراد آباد میں باقاعدہ مرکز کی شاخ کا قیام عمل میں آگیا ہے۔

۵۔ ۲۲ مارچ ۱۹۸۷ کی شام کو ذاکر باغ (نئی دہلی) میں تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ایک اجتماع ہوا۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز نے ایک تقریر کی۔ تقریر کا موضوع تھا: مسلمانوں کے مسائل کا حل قرآن کی روشنی میں۔ جناب شیخ عبد اللہ صاحب (آئی اے ایس) نے اس اجتماع کی صدارت کی اور جناب ڈاکٹر محسن عثمانی صاحب نے افتتاحی تقریر کی۔

۶۔ پاکستان کے انگریزی اخبار فرنٹیر پوسٹ (پشاور) نے اپنے شمارہ ۷ مارچ ۱۹۸۷ میں الرسالہ کا ایک مضمون شائع کیا ہے اور اس کا عنوان حسب ذیل الفاظ میں قائم کیا ہے:

A religious scholar's view

اس طرح الرسالہ کے مضامین کثرت سے اخبارات ورسائل میں نقل کیے جا رہے ہیں اور

بالواسطہ انداز میں اسلامی مرکز کے پیغام کو پھیلانے کا ذریعہ بن رہے ہیں ۔

۷۔ پچھلے دنوں ملک کے مختلف مقامات پر ہونے والے اجتماعی مواقع پر اسلامی مرکز کی مطبوعات کا اسٹال لگایا گیا۔ خدا کے فضل سے قابل لحاظ کامیابی حاصل ہوئی۔ چند مقامات کے نام یہ ہیں :

بھوپال کے تبلیغی اجتماع میں	۲۰ — ۲۲ دسمبر ۱۹۸۶
اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن ، بنگلور	۲۶ — ۲۸ دسمبر ۱۹۸۶
نیشنل بک فیئر، تریوندرم	۱۰ — ۲۰ جنوری ۱۹۸۷
نیشنل بک فیئر، کلکتہ	یکم — ۱۰ فروری ۱۹۸۷

ان مواقع پر کافی بڑی تعداد میں لوگ بک اسٹال پر آئے اور معلومات اور کتابیں حاصل کیں۔ کلکتہ کے اسٹال پر آنے والوں میں مسٹر ایم جے اکبر (ڈیلی ٹیلی گراف) اور نوبل انعام یافتہ انگریز ولیم گولڈنگ (Dr William Golding) بھی تھے۔ ان لوگوں کو انگریزی کتابیں ہدیۃً پیش کی گئیں۔

۸۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ نہایت توجہ کے ساتھ الرسالہ کا مطالعہ کر رہا ہے اور اس سے دینی تاثر قبول کر رہا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک خط (۱۶ مارچ ۱۹۸۷) کا ایک حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے :

> Since I became a regular subscriber of your esteemed monthly journal Al-Risala,I am studying it regularly and finding it very absorbing, thought-provoking, analytical and enlightening. Your effort is highly praiseworthy and deserves the support from every nook and corner of our society.
> *Syed Shafiuddin, E-64, Foch Square, New Delhi 110001*

۹ علمی اداروں میں الرسالہ جس نظر سے دیکھا جا رہا ہے اس کا اندازہ خطوط سے ہوتا رہتا ہے۔ یہاں ادارہ معارف اسلامی (منصورہ، لاہور) کا خط مورخہ ۲۷ دسمبر ۱۹۸۶ نقل کیا جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں : آپ کی طرف سے ہمیں ماہنامہ "الرسالہ" تقریباً موصول ہوتا رہتا ہے اس میں عصر حاضر کے مسائل کو بڑی تفصیل اور حکمت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ اس لیے الرسالہ ہمارے علمی و تحقیقی کام میں بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ لیکن اس سال کے پرچے

جو نہیں موصول ہو سکے ، مہربانی فرما کر ارسال کر دیں اس میں ہمیں مارچ ، جون ، اکتوبر ، نومبر اور دسمبر ۸۶ ء کے پرچے موصول نہ ہو سکے ۔ ہمیں سال کے آخر میں فائل کو مکمل کر کے اس کی جلد بندی کرانی ہوتی ہے ۔ آپ مہربانی فرما کر تعاون فرمائیں ۔ ہم بے حد ممنون ہوں گے ۔

۱۰۔ مرکز کی نئی کتاب " خاتون اسلام " کے بارہ میں قارئین کی طرف سے نہایت اعلیٰ رائیں موصول ہو رہی ہیں ۔ ایک صاحب بمبئی سے اپنے خط (۲۱ مارچ ۱۹۸۷) میں لکھتے ہیں : خاتونِ اسلام پڑھ رہا ہوں ۔ میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ آپ کی یہ کتاب اپنے موضوع پر اردو میں پہلی کتاب ہے ۔ نہایت موثر اور مدلل ۔ میرے خیال میں اس کی انگریزی زبان میں اشاعت بہت ضروری ہے (ندیم صدیقی)

۱۱۔ مرکز کی ڈاک میں برابر ایسے خطوط آرہے ہیں جن میں یہ درخواست شامل ہوتی ہے کہ انھیں مرکز کی کتابوں کو دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنے کی اجازت دی جائے ۔ مثلاً بنگلہ ، ملیالم ، پشتو ، سندھی ، وغیرہ ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرکز کی دعوت خدا کے فضل سے نہایت تیزی کے ساتھ دوسرے لسانی علاقوں میں پھیل رہی ہے ۔

۱۲۔ ایک صاحب مرکز کی مطبوعات اور الرسالہ کے بارہ میں خط ۱۶ مارچ میں تحریر کرتے ہیں :

'Some books are,' to quote Bacon, 'to be tasted, others to be swallowed, and some few to be chewed and digested.' Your magnum opus 'Muhammad: The Prophet of Revolution' and other thought-provoking publications belong to the last category. I relish to read regularly your prestigious periodical (Al-Risala) which is like a lodestar on the otherwise murky horizon of intellectual bankruptcy.
Tariq A. Shah, 35 New Colony, Sopore 193201

۱۳۔ ایک صاحب نوادہ (بہار) سے اپنے خط میں لکھتے ہیں : الرسالہ کے واسطے سے آپ سے رابطہ قائم ہے اور تا زندگی قائم رہے گا ، انشاء اللہ ۔ ایک آدمی بہت ساری کتابیں مطالعہ کرے ، مختلف زبانوں اور مختلف موضوعات پر کتابیں ۔ کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ اور ہو بھی تو چھان پھٹک کر کام کی باتیں اخذ کرنے کا سلیقہ جو خداداد ہوتا ہے وہ بھی تو ہونا چاہیے ۔ دین بھی سنورے اور زندگی بھی ، الرسالہ اسی کا بہترین حل ہے (نذیر الحق)

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۵ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسؤل نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

D(SE) 243 R.N. No. 28822/76 May 1987 No 126

اسلامی شریعت میں عورت کا مقام
اسلام اور جدید تہذیب کا تقابل

از: مولانا وحیدالدین خاں
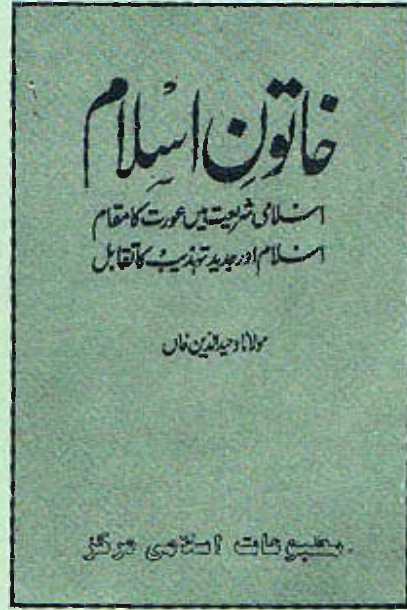
عورت کا درجہ اسلام میں وہی ہے جو مرد کا درجہ ہے۔ عزّت اور احترام کے جو احکام ایک صنف کے لئے ہیں وہی احکام دوسری صنف کے لئے بھی ہیں۔ دنیا کے حقوق اور آخرت کے انعامات میں دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ البتہ اسلام کے نزدیک مرد مرد ہے اور عورت عورت۔ زندگی کا نظام چلانے میں دونوں برابر کے شریک ہیں، تاہم فطری فرق کا لحاظ کرتے ہوئے اسلام نے دونوں کے درمیان تقسیمِ کار کا اصول رکھا ہے نہ کہ یکسانیتِ کار کا اصول۔

(صفحات ۱۹۲، قیمت ۳۰ روپیہ)

مکتبہ الرسالہ

سی-۲۹، نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی-۱۳ فون: 697333, 611128

Rs. 4